میر احمد نوید

جلد نہم

انتخاب

مرتّب

عفت نوید

تذکرے سب کے پھر رہیں گے دَھرے
جب مِرا انتخاب نکلے گا
میر تقی میر

انتساب

عفت نوید کے نام

ہوش مندوں نے مجھے دیوانہ کیا جبکہ میری دیوانی عفت نوید مجھے ہوش میں لائی یعنی میرا سب کچھ میری شریکِ حیات عفت نوید کے نام ہے جو میرا جوگ لے کر عفت زمان سے عفت نوید ہوئی اور جس نے ساری زندگی زمانے کے دُکھوں کے ساتھ ساتھ میرا جنون بھی سہا جبکہ مجھے اور میرے بچوں کو ایک کامیاب زندگی عطا کی اور اپنی تحریروں سے انسانوں میں بیداری اور شعور پیدا کیا۔

نوؔید اُس کا نوؔید جس کی عفت اور عفت اُس کی عفت جس کا نوؔید یعنی جو نوؔید کا نہیں وہ عفت کا نہیں اور جو عفت کا نہیں وہ نوؔید کا نہیں۔

اُس طرف دیکھتی دنیا کے تحیّر سے اِدھر
حیرتِ عشق نے معشوق کو عاشق دیکھا

میر احمد نوؔید

سب نے رد کر دیا تو پھر میں نے
اپنے ہونے کا اعتبار کیا

میر احمد نوید

1

''مَیں'' ہے کیا تم کو بتانے آیا ہُوں
مَیں تمھیں تم سے مِلانے آیا ہُوں

پائی ہے جس کے لئے تم نے یہ آنکھ
مَیں وہی جلوہ دِکھانے آیا ہُوں

پائے ہیں جس کے لئے تم نے یہ کان
مَیں وہی نغمہ سنانے آیا ہُوں

پائے ہیں جس کے لئے تم نے حواس
مَیں اُسی حِس کو جگانے آیا ہُوں

پائے ہیں جس کے لئے تم نے یہ پاؤں
مَیں اُسی رہ پر چلانے آیا ہُوں

جس زمیں میں تُم نے دوزخ بوئی ہے
مَیں وہیں جنت اُگانے آیا ہُوں

کرو ختم جھگڑا، نشہ اپنا اپنا
خودی اپنی اپنی، خدا اپنا اپنا

سوال اپنے اپنے، جواب اپنے اپنے
یہ 'کیوں' اپنا اپنا، یہ 'کیا' اپنا اپنا

سنو 'مَیں' سے 'تو' تک، سنو 'تُو' سے 'مَیں' تک
ہے سب کے لیے، آئینہ اپنا اپنا

یہ مستی کا سجدہ، اَلستی کا سجدہ
قضا اپنا اپنا، ادا اپنا اپنا

پلٹنا ہے سب کو احد ہی کی جانب
مکمل کرو، دائرہ اپنا اپنا

ثبوت اپنے ہونے کا، دینا ہے سب کو
جلانا ہے سب کو، دِیا اپنا اپنا

خلق کر کے عقل کو ''کیوں'' اور ''کیا'' کیوں ہوگئے
یہ مجھے بندہ بنا کر تم خدا کیوں ہوگئے

نعمتِ دنیا و دیں کیا یہ بھی ہے کوئی مزا
سب مزے اک ایک کر کے بے مزا کیوں ہوگئے

کیا پڑی افتاد آخر کہتے سنتے ماجرا
کہتے سنتے ماجرا بے ماجرا کیوں ہوگئے

کس کو سمجھائیں بر آیا بر نہ آیا مُدّعا
ہوگئے بے مُدّعا بے مدّعا کیوں ہوگئے

کیا بہ طرزِ عشق کوئی مسئلہ رکھتے ہیں آپ
چلئے مانا ہوگئے شاعر بھلا کیوں ہوگئے

کیا حُسن ہے چہرے سے نکلتی ہیں شعائیں
بینائی چلی جائے اگر آنکھ ہٹائیں

ایک سناٹے کا سینے میں
بھاگنا دوڑنا سا رہتا ہے

روئیے ہنسیے پسِ نوحہ و نغمہ صاحب
کیا تماشے میں تماشے سے سِوا ڈھونڈتے ہیں

یہ مانا بیچ میں نقطہ ہے حاضر و غائب
الف سے پہلے ہے کیا اور یے کے بعد ہے کیا

ازل ابد میں نہ پڑ کر لے خود کو گُم یعنی
نہ ابتدا کا سرا ہے نہ انتہا کا سرا

اِس بیچ سے اٹھ جائے اگر دل کا دھڑکنا
خاموشی ہی پھر کُن کی بنا ہے کہ نہیں ہے

تم عشق کا خچّر کہ گدھا عقل کا لاؤ
ہم مست ہیں ہم کو کہیں جانا ہی نہیں ہے

ہر اک کے لئے میں تو جُدا ہوگیا خود سے
میری طرح مجھ سے کوئی مِلتا ہی نہیں ہے

وہ مرتے ہیں اِس طرح جیے ہی نہ تھے جیسے
اور جیتے ہیں اِس طرح کہ مرنا ہی نہیں ہے

مانا اِسے سُنانے میں تُو نے تو عُمر کی
اک آہ کا یہ قصّہ کسی نے سُنا بھی کیا

گھٹن سے سانس خزاں سے بہار کھینچتے ہیں
ہمی ہیں جبر سے جو اختیار کھینچتے ہیں

ہمی ہیں وہ جو حقیقت کا وزن اٹھائے ہوئے
مہارِ ناقۂ لیل و نہار کھینچتے ہیں

خدا کرے کہ نہ اُن پر کھُلے حقیقتِ وصل
وہ خوش نصیب ہیں جو انتظار کھینچتے ہیں

اک وہ ترے وصال کے بیٹھے ہیں دعویدار
اک ہم ترے خیال سے آگے نہ جاسکے

مسجد ہے مدرسہ ہے نہ دیوارِ خانقاہ
مجھ پر جو پڑ رہا ہے وہ سایہ کچھ اور ہے

اِسی زماں سے اِسی مکاں سے نیا زمانہ بنا رہا ہوں
میں اک ''نہیں'' سے اور ایک ''ہاں'' سے نیا زمانہ بنا رہا ہوں

زمیں کی چند اک خرابیاں بھی نویدِ تعمیرِ نَو بنی ہیں
ہلاکتِ ہفت آسماں سے نیا زمانہ بنا رہا ہوں

وہ نشّہ جس کی لبالبی سے مِرا پیالہ چھلک رہا ہے
اُسی کی مستیِ غیب داں سے نیا زمانہ بنا رہا ہوں

رواں دواں ہے یہ وقت پیہم رواں دواں ہیں یہ کہکشائیں
رواں دواں پر رواں دواں سے نیا زمانہ بنا رہا ہوں

کہ از ستارہ و تا ستارہ بس ایک گردش ہے بے کنارہ
اُٹھا کے کچھ راکھ درمیاں سے نیا زمانہ بنا رہا ہوں

میانِ اجزائے آب و گل اک ستارہ رکھا ہے کیمیا میں
سو کچھ یقیں سے سو کچھ گماں سے نیا زمانہ بنا رہا ہوں

مِرا ٹھہرنا بھی اک زمانہ مِرا گزرنا بھی اک زمانہ
ٹھہر کے جاں میں گزر کے جاں سے نیا زمانہ بنا رہا ہوں

جہاں تھی تہذیب اب نشاں ہے نشاں بگولوں کے درمیاں ہے
غُبار ہوتے ہوئے نشاں سے نیا زمانہ بنا رہا ہوں

جواب جس کا نہیں وہ سوال آدمی ہُوں
مَیں خوابِ ماضی و فردا و حال آدمی ہُوں

کبھی پہنتا ہوں خود کو کبھی اُتارتا ہُوں
مَیں آپ اپنے لئے اک وبال آدمی ہُوں

مَیں آپ اپنی گرہ آپ اپنا ناخن میں
میانِ واجب و ممکن محال آدمی ہُوں

بہت خیال سے چھونا مجھے کہ میں صاحب
وجود رکھتا ہے جو وہ خیال آدمی ہُوں

تم عندلیب ہو ناآفریدگاں کے نوؔید
مَیں آہ دشتِ سگاں میں غزال آدمی ہوں

گُم ہو رہو خود آپ میں گر خود کو پاسکو
کیا مجھ کو ڈھونڈ تے ہو خلا ہے مِرا وجود

دل پہ کیا اقراء سے پہلے ہی کتاب القا نہ تھی
کیا نہ تھی موجود اِس دل میں زباں سے پہلے بات

تھی سر پہ خاک بہت پھر بھی کم تھی وحشت سے
سو اور ڈال لی اک مشتِ خاک برسرِ خاک

اقرار سے وجود نہ انکار سے عدم
اِن دونوں زاویوں سے الگ ہے وجودِ ذات

وہ جو ''مَیں'' بن کے مجھ پہ ٹوٹی ہے
وا دریغا مَیں وہ قیامت ہُوں

آرائشِ جمال سے فرصت نہیں اُسے
ہم کو بھی کوئی کام نہیں ہے سوائے عشق

اے حُسن اب یہ خواب حقیقت سے جُڑ گیا
اب جاگنا بھی عشق ہے سونا بھی عشق

یہ کیا ہُوا ''نہیں'' کا ''نہیں'' ڈھونڈنے میں ہائے
وہ کام آ پڑا ہے کہ فرصت کہیں جسے

ملبوس کوئی بھی نہیں قامَت کے برابر
یہ آئنہ خانہ نہیں حیرت کے برابر

مکتب میں مِرا سر تہہِ شمشیرِ الف ہے
لکھنا کہ یہ منصب ہے شہادت کے برابر

اِس انجمن آرائیِ عالم کو جو دیکھو
آئے گی نظر یہ تمہیں خلوت کے برابر

بیکار ہوں مَیں اے مِرے سیّارہ و افلاک
کچھ کام نکالو مِری فرصت کے برابر

مَیں جاں سے وہ آئینۂ خود بینی سے گزرا
اب حُسن ہوا میری محبّت کے برابر

آنسو جو رکا ہے سرِ مژگاں و پسِ ضبط
بہہ جائے تو یہ بھی ہے قیامت کے برابر

اِس عصر کے بازار میں یوسفؑ سا بِکا ہُوں
پہنچے گا کوئی کیا مِری قیمت کے برابر

''میں'' سے لے کے ''تُو'' تلک ''تُو'' سے لے کے ''مَیں'' تلک
میں ہوں آپ ہی جواب مَیں تھا آپ ہی سوال

یہ کیا مذاق کہ انبوہِ غم گساراں میں
ترے لیے جو پریشاں نہیں ہے وہ بھی ہے

لے جاؤ اپنے نشتر و مرہم تُم اپنے ساتھ
اب درد چاہتا نہ دوا چاہتا ہُوں مَیں

کہاں سے گزروں نہ گزروں کہاں سے وائے سفر
کہ ہر نظارہ یہ کہتا ہے رفتنی ہُوں میں

تُو ہر اک جا ہے بتا میں بھی کہیں ہُوں کہ نہیں
اور پھر جب تیرے ہونے کی سند بھی مَیں ہُوں

جو خواب ہُوں تو کھُلے مجھ پہ کوئی رمزِ ثبات
کبھی مجھے مِری وسعت سے دُور جا کے پکار

یہ بات کیا ہوئی آخر وہ لب ہیں مثلِ گلاب
مثال آئی کہاں سے مثال کیا شے ہے

پے بہ پے لمحہ بہ لمحہ یہ تماشا کیا ہے
اور دیکھو ابھی تم نے ابھی دیکھا کیا ہے

بحرِ ہستی کے تو معنی ہیں کوئی سطح نہ تہہ
ڈوبنا کیا ہے یہاں اور ابھرنا کیا ہے

تمھیں معلوم ہے تم موج ہو جس دریا کی
اک روانی کے سوا اور وہ دریا کیا ہے

بے تمنا ہوئے جانے کی تمنا کے سوا
کوئی پوچھے بھی تو کیا کہیے تمنا کیا ہے

خدا نہیں کہ خدا ہے مجھے نہیں معلوم
کہاں تلک یہ خلا ہے مجھے نہیں معلوم

جنھوں نے خود پہ کیا شک سی نعمتوں کو حرام
وہ پھر بتوں کی طرح کعبۂ یقیں میں رہے

کبھی بھول کر بدن پر نہ لیا لباس اُس نے
وہ جو خلوتِ عجب میں کوئی پھر رہا ہے عُریاں

کوئی تو ٹھہرے کہ پُوچھیں یہ گزرنے والے
وہم کس چیز کو کہتے ہیں حقیقت کیا ہے

وہ خواب ہی نہیں نہ کھُلے جس کی لَو سے آنکھ
وہ عشق ہی نہیں جسے اپنی خبر نہ ہو

جو خود میں دیکھا ہے اب وہ جہاں میں دیکھنا ہے
کہ اِس مکاں کو کہیں لا مکاں میں دیکھنا ہے

چلی ہے سمتِ مخالف میں طبعِ ماہیِ عشق
ہے کتنا دَم ترے آبِ رواں میں دیکھنا ہے

ابھی تو محوِ تماشائے گُل ہے دیدۂ دل
بہار کیا ہے یہ دل کو خزاں میں دیکھنا ہے

بنے ہیں چشمِ تغیّر اِس ایک حسرت میں
جہاں کو آئینۂ کہکشاں میں دیکھنا ہے

دِکھا کے جلوۂ اُلفت ہماری آنکھ نہ مُوند
ابھی تو تجھ کو صفِ دشمناں میں دیکھنا ہے

خامشی کو پردۂ سازِ سخن کافی نہیں
یہ وہ خلوت ہے کہ جس کو انجمن کافی نہیں

کیا دکھانا ہے کہ عریانی پڑی جاتی ہے کم
کیا چھپانا ہے کہ جس کو پیرہن کافی نہیں

گر نہ کہیے زندگی جاتی ہے گر کہیے تو مَوت
روح کی حسرت نکلنے کو بدن کافی نہیں

کس نزاکت سے گزر کر کس نفاست سے جناب
فن وہاں تک آ گیا ہے اب کہ فن کافی نہیں

یہ وہ حسرت ہے جسے میرا بھی مل جانا ہے کم
یہ وہ تنہائی ہے جس کو دوسرا کافی نہیں

چاہیے بے خوفیِ معلوم میں کوئی خدا
خوفِ نا معلوم کو خوفِ خدا کافی نہیں

ہو سکے تو دل کو اب بے مدّعا کر لیجئے
اک فقط یہ ترکِ عرضِ مدّعا کافی نہیں

قیمتِ عشقِ زلیخا نہیں معلوم مگر
حُسنِ یوسفؑ ہے ٹکے کا جو زلیخا ہی نہ ہو

آج رخصت ہے تمنّا کی مگر یہ مِرا دل
ایسے خاموش ہے جیسے کبھی دھڑکا ہی نہ ہو

بدلا ہے اپنے ہاتھ سے مُرشد نے میرا ہاتھ
ہُوں اپنے ہاتھ پر ہی مَیں بیعت خدا گواہ

کچھ نہیں عزیٰ وھُبَل لات و منات کچھ نہیں
ذات وصفات سے نکل ذات وصفات کچھ نہیں

خبط وگمان و وہم وشک ریگ وغبار وگرد وخاک
عقل کی فتح کچھ نہیں عشق کی مات کچھ نہیں

مَیں ہُوں کہیں مگر کہاں مَیں ہُوں جہاں مگر وہاں
حُسن میں بات کچھ نہیں عشق میں بات کچھ نہیں

اپنے یقین کی قسم اپنے گمان کی قسم
عشق کا دام کچھ نہیں عقل کی گھات کچھ نہیں

وحشتِ مہر کے سوا اور نہیں ہے کچھ یہ دن
گریۂ ماہ کے سوا اور یہ رات کچھ نہیں

مہرو مہ و انجم کا تماشا بھی نہ ہوتا
ہوتا نہ اگر مَیں تو نہ ہونا بھی نہ ہوتا

قطرے سے ہے دریا میں تلاطم پسِ ہر موج
قطرہ جو نہ ہوتا تو یہ دریا بھی نہ ہوتا

اِس عشق کے ہونے سے ہے پردہ اُسے درپیش
یہ عشق نہ ہوتا تو یہ پردہ بھی نہ ہوتا

ممکن جو نہ تھا وہ بھی ہمی سے ہوا ممکن
آتے نہ اگر ہم تو تماشا بھی نہ ہوتا

اب نگہ حائل نہیں لے دیکھ یہ رنگِ وصال
چشم خوں آلود ہے ٹوٹا پڑا ہے آئنہ

ہمیں خبر ہی نہیں کب گئی خبر اپنی
کب آئے گی ہمیں اپنی خبر نہیں معلوم

کچھ نظر آئے تو پھر کچھ نظر آتا ہی نہیں
دیکھنے کی طرح تم نے ابھی دیکھا ہی نہیں

اک تمنّا کہ تمنّا ہی نہیں ہے جیسے
ایک سودا ہے کہ جیسے کوئی سودا ہی نہیں

عاشق ہُوں مِرے تن سے جھلکتا ہے وہ معشوق
یونہی تو دوانہ نہیں عالم مِرے دل کا

کشید کرتا ہے نشّہ خود اپنی خلوت سے
شریکِ محفلِ مَے جامِ واژگوں ہے جنوں

خیالِ دیر نہ فکرِ بُتاں ، نہ ہوش اپنا
جنوں سہی مگر اب اِس قدر بھی کیوں ہے جنوں

وہ کھیل تھا سمجھتا تھا تُو جس کو کوئی کام
اے طفلِ عقل بیٹھ کے فرصت کو اب نہ رو

ہے فنا دہر کا مقدور بقا ہو کہ نہ ہو
مَوت خود ایک حقیقت ہے خدا ہو کہ نہ ہو

سر پٹکنے ہی میں لذّت وہ میّسر ہے کہ اب
درِ کعبہ سے غرض کس کو ہے وا ہو کہ نہ ہو

نا امیدی کو مگر اُس نے نہ آنے دیا پاس
چاہے وحشت سے کوئی کام بنا ہو کہ نہ ہو

موجود ہو وجود ہو کیجے بجا ہے شک
بس وہ ہی با یقیں ہے کہ جو کر رہا ہے شک

حُجّت کہاں یقیں کو کہاں یہ دماغ ہے
گر عقل پر کُھلا ہے تو شک سے کُھلا ہے شک

تم شک میں اور یقیں میں رہو گم مجھے تو یاں
شک میں یقیں ملا ہے یقیں میں ملا ہے شک

پہلے بھی یاں بڑے بڑے آئے ہیں پُر یقیں
اک ایک کر کے اٹھ گئے کس سے اٹھا ہے شک

کیا خوب کہ ہو سکتا ہوں یا ہو نہیں سکتا
ہونا تو نہ ہونے سے جدا ہو نہیں سکتا

آلودۂ خوں لاکھ ہوں یاں ناخنِ مجنوں
وا پیچِ خمِ زلفِ دوتا ہو نہیں سکتا

بیٹھا یہ سوچتا ہے کیا وقت بہت گزر گیا
کاسہ اٹھا صدا لگا وقت بہت گزر گیا

حال میں تھا کہ قال میں جانے تھا کس خیال میں
مجھ کو پتا نہیں چلا وقت بہت گزر گیا

یا یہ زماں بدل گیا یا یہ مکاں بدل گیا
یا میں ذرا سا سوگیا وقت بہت گزر گیا

مجھ سے مجھے مِلا چکی مَوت بھی آ کے جا چکی
دیکھنا بج رہا ہے کیا وقت بہت گزر گیا

تھمے تھمے تھمے تھمے دبے دبے دبے دبے
ذرا ذرا ذرا ذرا وقت بہت گزر گیا

کیا کرو، کیا نہ کرو، وقت ہُوا جاتا ہے
چاہے کچھ ہو کہ نہ ہو وقت ہُوا جاتا ہے

نالہ بلبل کا سنو چاہے سنو نغمۂ گُل
چاہے کچھ بھی نہ سنو وقت ہُوا جاتا ہے

سر کو خنجر تلے یا سنگ کی زد پر رکھو
چاہے زانو پہ دھرو وقت ہُوا جاتا ہے

چاہے آہستہ چلو چاہے چلو تیز قدم
یا رُکو یا نہ رُکو وقت ہُوا جاتا ہے

چاہے دیوانہ بنو چاہے بنو صاحبِ ہوش
چاہے کچھ بھی نہ بنو وقت ہُوا جاتا ہے

شے بہ شے لا بہ لا تحیّر ہے
علم کی انتہا تحیّر ہے

جو چُکا دے وہ آئنہ لے جائے
قیمتِ آئنہ تحیّر ہے

ہم تحیّر زدہ ہیں بندۂ عشق
اور ہمارا خدا تحیّر ہے

جانے کیا ہوگا کیا نہ ہوگا وہ
جس کا بندِ قبا تحیّر ہے

کیا کہا کیا سنا مگر یونہی
جو کہا جو سنا تحیّر ہے

سیر کو یا سفر کو جاتے ہیں
راستے یہ کدھر کو جاتے ہیں

کچھ خبر ہے یہ عشق کا ہے سفر
منہ اٹھائے کدھر کو جاتے ہیں

دیکھتی ہوگی راہ کب سے وہ تیغ
لے کے اب ہم بھی سر کو جاتے ہیں

آپ دل پر نہ لیں ہماری بات
ہم تو بس یونہی بات کر رہے ہیں

جی کسی کام میں نہیں لگتا
جانے کیا کام ہے جو کر رہے ہیں

ہم تو بس کر رہے ہیں رات کو دن
ہم تو بس دن کو رات کر رہے ہیں

مَوت سے مر رہی ہے یہ دنیا
اور ہم زندگی سے مر رہے ہیں

مَیں بھی اِن منظروں کا حصہ ہُوں
مجھ کو بھی آنکھ بھر کے دیکھ ذرا

اشک ٹپکائے اور لہو دیکھے
مشغلے چشمِ تر کے دیکھ ذرا

خود کو اے محوِ آئنہ داری
آئنوں سے گزر کے دیکھ ذرا

وہم کی کیا یہی حقیقت ہے
''مَثل'' میں ''کیوں'' مثال میں ''کیا'' ہے

ہر اک بقا ہر ایک فنا سے گزر گیا
یہ درد تو دوا و دعا سے گزر گیا

خود سے گزر کے خود سے مِلا تو مجھے لگا
اپنی تلاش میں مَیں خدا سے گزر گیا

جس دن سے مجھ پہ علم برہنہ ہوا نوؔید
عمّامہ و عبا وقبا سے گزر گیا

مَیں جز و کل کا تماشا نہیں کہ کھُل جاؤں
کسے خبر کہ میں قطرہ ہُوں اور نہ دریا ہُوں

فقیر و سالک و درویش و رند و مست و ملنگ
جلو میں لے کے نکلتے ہیں جب مَیں چلتا ہُوں

کیوں ہم سے دیکھنے کا تقاضا کیا گیا
کیا ہم سے پوچھ کر یہ تماشا کیا گیا

جلوہ نہ تھا تو کس لیے پھر آنکھ دی گئی
کوئی نہ تھا تو کس لئے پردہ کیا گیا

سوائے اپنے کسی کو میں جانتا بھی نہیں
بچھڑ گیا تو میں پوچھوں گا کس سے اپنا پتا

وہ آئنہ نظر آیا جو مجھ سے گرد ہٹی
پھر اُس کے بعد مجھے دُوسرا دکھائی دیا

ثبوتِ وہم میں ہر گز نہ لا حقیقت کو
بیان کرنے کو ممکن، محال پر مت جا

مَیں تیرے عشق میں خود بن گیا ہوں تجھ جیسا
مگر مَیں کون ہوں میری مثال پر مت جا

یہ باغ کیا ہے اگر جاننے کی خواہش ہے
تو مفت دی ہوئی تشریحِ باغباں سے نکل

وہی بہار و خزاں سرد و گرمِ ابر و ہوا
مسلسل ایک ہی تکرار کے جہاں سے نکل

دامِ ہستی میں نہیں آئے جو ہم اہلِ جنوں
پھر ہمارے سامنے کیا ہے فنا کچھ بھی نہیں

’ہے‘ گم ہوئی ’نہیں‘ میں، نہیں ’ہے‘ مَیں گم ہوئی
’مَیں‘ اور ’تُو‘ کے بیچ رہا کیا، نہ مَیں نہ تُو

ابھی تو وہم ہی معنی طلب ہے
اور اُس پر مَیں، حقیقت چاہتا ہُوں

’تھا‘ اور ’ہے‘ کو لے کے روانہ ہوئی خرد
حالت سے حال لے کے، جنوں بھی چلا گیا

’لا‘ پہ پردہ پڑا ہے، ’کیا‘ چپ ہے
کیوں نہ مَیں چپ ہُوں جب خدا چپ ہے

’ہے‘ کی کیا ہست، کیا نہیں کی نیست
اِک سِرا گم ہے، اِک سِرا چپ ہے

بولیے، کچھ تو بولیے صاحب
اِبتدا چپ ہے، انتہا چپ ہے

جانے کیا ہو رہے ہیں راز و نیاز
حیرتی چپ ہے، آئینہ چپ ہے

لازمانی کلام جاری ہے
'ہے' ہے خاموش، اور 'تھا' چپ ہے

اِک زمانہ تھا، بولتا تھا نوؔید
ایک مدت سے اب، سُنا چپ ہے

بتا، کیا چشمۂ آبِ بقا ہے پھُوٹنے والا؟
خدایا، اب تو میری تشنگی بھی جارہی ہے

ہماری فکر بھی تھی خاص، اور ہم بھی تھے خاص
مگرجو بیت گئی ہم پہ، عام کرتے ہوئے

بس اک تم ہو جو دل تھامے ہوئے گم سُم کھڑے ہو
دل افگارو! وہ دیکھو زندگی تو چل رہی ہے

زمانہ ہم سے یونہی بے سبب نہیں ناخوش
سُبک گزر رہے ہیں تو گراں گزر رہے ہیں

عقل کو تو کسی صورت نہ مِلا نقل کا اصل
دل بھی کیا چیز ہے لے آیا شباہت پہ یقیں

خیال ہے وہ جسے سب سمجھ رہے ہیں وصال
کسی نے دیکھی کہاں ہے وصال کی صورت

نہ ہے حقیقتِ وہم اور نہ ہے حقیقتِ خواب
شراب لاؤ! کہاں کا سبق کہاں کی کتاب

یہ لمحہ لمحہ بکھیرا گیا ہے کوئی وجود
کہ حرف حرف سمیٹی گئی ہے کوئی کتاب

آئینے میں کیا ڈھونڈیے حیرت سے زیادہ
صورت میں تو کچھ بھی نہیں صورت سے زیادہ

کچھ وسعتِ قطرہ نہیں جُز تنگیِ دریا
قد ہو نہ سَکا بڑھ کے بھی قامَت سے زیادہ

خاموشی سے بولا نہ گیا نطق سے آگے
ظاہر نہ ہُوا رنگ بھی رنگت سے زیادہ

یا عقل سے سوچا نہ گیا عقل سے آگے
یا کھُل نہ سکا وہم حقیقت سے زیادہ

امکان ہی امکان ہے امکان سے آگے
حسرت میں مِلا کچھ نہیں حسرت سے زیادہ

کیا حالِ سفر کہیے نہ آغاز نہ انجام
منزل نہ کھُلی ہم پہ مسافت سے زیادہ

نہ ''کیا'' نہ ''کیوں'' کہاں لے آئی بے خودی ہم کو
کہ اب رہا ہی نہیں ہوشِ آگہی ہم کو

پھر اُس کے بعد نہ ''ہے'' تھا نہ تھا ''نہیں'' کوئی
جو اپنی بے خبری کی خبر ہوئی ہم کو

نہ کرتے خود کو جو گُم اے تلاشِ لاموجود
نگل ہی جاتی بلآخر کوئی کمی ہم کو

کسی کی حسرتِ زلفِ ہزار پیچاں سے
ہماری سادگی لے کر گزر گئی ہم کو

نہ اب سُبک ہیں نہ ہم خود پہ ہیں گراں یعنی
بَلا جو سر سے گئی ساتھ لے گئی ہم کو

سائیں، باوا، میر صاحب، بادشاہ
اتنے ناموں پر بھی میں تنہا ہوں، آہ

کردے تنہائی کو یکتائی نصیب
اے علیؑ اے بے پناہوں کی پناہ

ماورائے رنگ مجھ کو رنگ دے
ماورائے لاسپید و لاسیاہ

مَیں کدھر، رستا کدھر، منزل کدھر
چل پڑا مَیں راہ جانے، جانے شاہ

یا غیاث المشتغیث و یا مغیث
یا علیؑ و یاعلیؑ و یاالہٰ

قشقہ کشانِ دَیر سے دَیر کی پوچھتے ہو کیا
دَیر کی تم سے کیا کہیں تم تو خدا کے ہو رہے

بیٹھا یہ سوچتا ہے کیا، وقت بہت گزر گیا
کاسہ اُٹھا صدا لگا، وقت بہت گزر گیا

حال میں تھا کہ قال میں جانے تھا کس خیال میں
مجھ کو پتا نہیں چلا، وقت بہت گزر گیا

یا یہ زماں بدل گیا یا یہ مکاں بدل گیا
یا میں ذرا سا سو گیا، وقت بہت گزر گیا

مجھ سے مجھے مِلا چکی مَوت بھی آ کے جا چکی
دیکھنا بج رہا ہے کیا، وقت بہت گزر گیا

تھمے تھمے تھمے تھمے دبے دبے دبے دبے
ذرا ذرا ذرا ذرا، وقت بہت گزر گیا

یہی عشق کا ہے اوّل یہی عشق کا ہے آخر
کہیں خود سے خود میں غائب کہیں خود میں خود سے حاضر

پسِ منزل و مسافر یہ سفر ہے خود سے خود تک
جو پہنچ گیا وہ منزل وہ جو رہ گیا مسافر

جو خبر ہے آئنہ ہے جو ہے آئنہ خبر ہے
نہ کوئی خبیر و مخبر نہ کوئی نظیر و ناظر

کسی نے مجھے گرایا کسی نے مجھے اٹھایا
نہ گرا کسی کی خاطر نہ اُٹھا کسی کی خاطر

مَیں خود آپ اپنا صاحب مَیں خود آپ اپنا بندہ
بہ خدا نہ کوئی صوفی بہ خدا نہ کوئی شاعر

عدد کو کھا گئی خود ہی عدد کی بے عددی
وہ بے بسی تھی کہ منہ دیکھتے رہے اعداد

او بے خبر ترے 'ہے' اور 'نہیں' سے کیا ہوگا
کہ بے تضاد ہے بنیادِ عنصرانِ تضاد

ماورائے بے دری و در ہے تُو پھر کیوں تری
عقل ہے سو در بہ در ہے دل ہے سو محوِ طواف

ہے سِیا فطرت نے عریانی چھپانے کے لئے
وجہِ آرائش نہیں ہے سبزہ و گل کا غلاف

نشّے میں تھا خودی کے مگر اتنا ہوش تھا
بندہ رہا خدا نہ ہُوا یوں کہ ننگ ہے

گر آئنے کو لگے وہ بھی زنگ ہوجائے
وہ روگ ہم کو خدا کی قسم لگا ہے میاں

تم بھی چاہو تو کفِ تاب الُٹ کر دیکھو
کس قیامت کی حیا دیدۂ بے باک میں ہے

دنیا میں آئے دھول میں اَٹ کے چلے گئے
بَل اپنے کھولنے میں لپٹ کے چلے گئے

دھرنے کو دل پہ یاں نہ اُٹھا ہاتھ پر سے ہاتھ
کاموں سے لوگ اپنے نمٹ کے چلے گئے

حیرت سرائے دہر میں ہم حیرتِ دہر
چیزوں کو بس اُلٹ کے پُلٹ کے چلے گئے

اِس دشتِ گم میں ہائے جو کہتے تھے خود کو گم
بھُولے ہوئے کدھر کے تھے بھٹکے چلے گئے

بکھرے پھر اک وجود سے پیدا کیا عدم
سمٹے پھر اِک عدم میں سمٹ کے چلے گئے

شمعِ فنا کو مژدۂ صبحِ بقا سے کیا
اِس دردِ دل کو کام ہو آخر دوا سے کیا

کیوں بندِ چشم توڑ کے سینے میں در نہ آئے
سیلِ بدن رُکے ترے بندِ قبا سے کیا

جز خامشی جواب نہیں کوئی میرے پاس
وہ پوچھ لے اگر کہ ہے مفہوم ''کیا'' سے کیا

دیکھا ہے کیا کہ گُم کیا حیرت میں اپنا آپ
چپ چپ کھڑے ہوئے ہو یہ تم آئنہ سے کیا

اِک بار جو دیکھا اُسے یوسفؑ کی نظر سے
آئینہ گزرگاہِ زلیخا نظر آیا

پڑتے ہی نظر جسم پہ تھم تھم کے پڑی آنکھ
کیا حسن تھا ہر عضو میں یکجا نظر آیا

عشق سے حسن جھلکتا نظر آتا ہے مجھے
رخِ مجنوں رُخِ لیلیٰ نظر آتا ہے مجھے

اتنا شفّاف ہے یہ آئینۂ کون و مکاں
سانس لیتا ہوں تو دھندلا نظر آتا ہے مجھے

بارِہفت افلاک بھی اِس ناتواں شانے پہ ہے
زلف سے کہنا کہ آہستہ سرِ شانہ کُھلے

جب طلسمِ آئنہ خود ہو نقابِ آئنہ
چشم پر کیسے حجابِ آئینہ خانہ کُھلے

مَوت نے جلوہ گری کی ہے کچھ ایسی مجھ میں
مجھ کو اپنا کبھی ارماں نہ ہُوا تھا سو ہُوا

اپنی کسی خلوت ہی میں سوچا ہُوا دیکھا
دیکھا یہاں جو کچھ بھی وہ دیکھا ہُوا دیکھا

جس حسن کا عاشق ہُوں میں اس حُسن کو مَیں نے
بے منّتِ آئینہ سنورتا ہُوا دیکھا

یہ بار بارِ عشق ہے اے ناتوانِ عشق
یہ بار اُٹھ گیا تو کوئی بار پھر نہیں

دشتِ امکاں میں پھرا بن کے بگولہ لیکن
یہ مہِ عیدِ تمنا مہِ کامل نہ ہُوا

دستِ لیلیٰ ہی اُٹھائے نہ ہی مجنوں سے اُٹھے
پردۂ ذات ہُوا پردۂ محمل نہ ہُوا

کاسۂ عشق بڑھاتا ہے کہ جاں دیتا ہے
واقفِ قیمتِ لیلیٰ ہُوا سائل نہ ہُوا

خیالِ نَو بہ نَو میں ہاتھ سے دل نکلا جاتا ہے
یہی حالت رہی دل کی تو ارماں کرلیا مَیں نے

جہاں پایا اُنہیں پھر آپ میں خود کو کہاں پایا
جہاں دیکھا اُنہیں بس خود کو حیراں کرلیا مَیں نے

حسرت ترے جلوے کی پھر بھی ہے ہر اِک دل میں
ہے کون تِرا جس سے پردہ نہ ہُوا ہوگا

اے وقت کے مرہم اب کچھ تو یہاں رہنے دے
اِک زخم ابھی ہے جو اچھا نہ ہُوا ہوگا

دیکھا ہے اُسے جب سے سوچا ہے اُسے جب سے
دیکھا نہ ہُوا ہوگا سوچا نہ ہُوا ہوگا

صدا سے تیز تغیّر کی چال ہے کہ نہیں
بدل رہا ہے زمانہ کمال ہے کہ نہیں

کہیں مِلے تو وہ پوچھے بغیر رہ نہ سکے
کوئی کہو کہ ہمارا وہ حال ہے کہ نہیں

ہمیشگی میں خلل ہے سکوت میں ہے خلل
یہ ایک دل کا دھڑکنا وبال ہے کہ نہیں

پڑے پڑے در و دیوار دیکھنے والے
ترا یہاں کوئی پرسانِ حال ہے کہ نہیں

اِس طرح دھڑکتا ہے کوئی دل مِرے دل میں
ہو جیسے مِرا مدِّ مقابل مِرے دل میں

رہنا تھا مِرے دل میں کسی غنچہ دہن کو
اور بس گیا اِک شورِ سلاسل مِرے دل میں

سب کا حق لے کے بھی محروم نظر آتا ہے
اتنا ظالم ہے کہ مظلوم نظر آتا ہے

اِس تماشے میں جو تم دیکھتے ہو روز و شب
کچھ بتاؤ کوئی مفہوم نظر آتا ہے

یہ مِرا دل ہے کہ ہے صفحۂ لوحِ محفوظ
جس میں آئندہ بھی مرقوم نظر آتا ہے

ہر ادا قیس کی وحشت کی نظر سے دیکھو
جب وہ خوش ہوتا ہے مغموم نظر آتا ہے

آئینۂ خودبینی اُس کو بھی قفس ٹھہرا
تجھ کو بھی محبت نے رکھا تہہِ دام اے دل

پھر موسمِ دار آیا پھر سینۂ زنداں میں
گونجا ترا نام اے دل ہو تجھ پہ سلام اے دل

نثار تجھ پہ لباسِ خزاں ، برہنہء عشق
کفن بھی چاہے تو قامت ترا چھپا نہ سکے

سن اے فدائے گُل ومُل خزاں ہے عیشِ دوام
بہار کیا ہے جو اِک گل کو بھی بچا نہ سکے

یہی کہ پردۂ محمل میں مرگ بیٹھی ہے
یہ راز قیس کو ہم اہلِ دل بتا نہ سکے

انتہا کوئی نہیں ہے ابتدا ہونے کے بعد
عشق کیا ہے جان لو گے مبتلا ہونے کے بعد

اب بجز سجدہ گزاری کیا کریں جائیں کہاں
آنکھ ہی کھولی ہے جب تیرے خدا ہونے کے بعد

اِک بار اُس نگاہ پہ مرنے کے باوجود
اِک بار اور مرنے کی حسرت نہیں گئی

جو آج خاک ہے کَل اُس کو گُل پکاریے گا
جو آج گُل ہے اُسے کل غبار کہیے گا

لہُولہُان کہیں پر پڑا مِلوں تو مجھے
حریفِ گردشِ لیل و نہار کہیے گا

سلام کہیے گا اُن سے پھر اُن سے بعدِ سلام
ہمارا دل ہے بہت سوگوار کہیے گا

رِس کر لہو نے فاش کیا چاکِ دل کا راز
ہر چند ہم تھے چاکِ گریباں سیے ہوئے

کب دماغِ دل نہ تھا کب حسن سے یاری نہ تھی
تب سے تھی جب سبزۂ خط کی نموداری نہ تھی

عشقِ بے تیشہ سے تا کوہِ گرانِ روز گار
کب یہ دن ہلکا تھا مجھ پر کب یہ شب بھاری نہ تھی

دی صدا مقتل نے جب لبیک کہہ کر اُٹھ گئے
سر بکف ہم کب نہیں تھے کب یہ تیّاری نہ تھی

تیزی نہ رہی خوں میں کہ اب دل نہ رہا وہ
دل ہو بھی تو کیا مدِّ مقابل نہ رہا وہ

کر لیتا میں کیا اُس کا جو غفلت بھی وہ کرتا
پر میری طرف سے کبھی غافل نہ رہا وہ

سیکھے نہ بدلتے ہوئے صحرا سے نئے ڈھنگ
کیوں قیس رہے وہ کہ جو محمل نہ رہا وہ

ہوتا کوئی ہم دونوں میں آساں تو تھی مشکل
مَیں خود بھی تو مشکل تھا سو مشکل نہ رہا وہ

دن کو ناکارہ و بے تاب پھرے، کون ہے یہ
شب کو بے نشّہ و بے خواب رہے ،کون ہے یہ

یا تو بے بات کرے گریہ و نالہ پیدا
یا کسی بات کی پروا نہ کرے، کون ہے یہ

لوٹتا ہے خس و خاشاک پہ لیکن خود کو
باعثِ گردشِ افلاک کہے، کون ہے یہ

اُن کے کوچے میں جو اِک خاک بسر تھا کل شب
مر گیا اور وہ پوچھا ہی کیے، کون ہے یہ

گردش اِک اور ہے اِسی گردش سے متّصل
تیری نظر ہے حلقۂ لیل و نہار تک

وہ آگ تھی کہ راکھ ہوئے جان و تن تمام
وہ ضبط تھا اُڑا نہیں کوئی شرار تک

کتنے جنم گئے ہیں سینے میں اشک بنتے
پلکوں پہ گو نمائش بس ایک پل رہی ہے

اے ذات کے سمندر کیا ہے تہوں کے اندر
اِک روشنی مسلسل تہہ سے نکل رہی ہے

کہتا تھا جب تغیّر سنتا نہیں تھا کوئی
اب لوگ کہہ رہے ہیں دنیا بدل رہی ہے

تلخیِ زیست نے کیا کیا نہ مزا چکھوایا
اپنے دانتوں کے تلے اپنا جگر آنے تک

اور بڑھ جاتا ہے صحرا جو بڑھاتے ہیں قدم
گردِ صحرا کہیں ہوجائیں نہ گھر آنے تک

آئنہ گرد سے پیدا ہے سیاہی سے کرن
یاں اندھیرا ہی اندھیرا ہے نظر آنے تک

بے کرانی کا سراب اُس پہ جو کھُلتا پسِ شوق
قطرہ خود کو نہ کبھی شاملِ دریا کرتا

مَیں خدا ہوتا تو کیا میں بھی پسِ بودو نبود
بیٹھ کر ہونے نہ ہونے کا تماشا کرتا

کیوں مگر حد سے گزرنے کا تقاضا نہ کرے
درد پھر درد ہے کیا فکرِ مداوا نہ کرے

بس میں اُس کے بھی کہاں پردہ کشائی آخر
کہو مجنوں سے کہ اب مِنّتِ لیلیٰ نہ کرے

خود کو پانے کی تمنا میں نہ کھودے خود کو
اس سے کہنا کہ بہت آئنہ دیکھا نہ کرے

نہیں رکھتا میں خیال اپنا چلو یونہی سہی
نہیں کرتا کوئی پروا مری اچھا نہ کرے

کیا بتائیں جو خبر حال کی آتی ہی نہ ہو
حال ہم بے خبروں سے کوئی پوچھا نہ کرے

دل کے بدلے میں کہو دل سے کہ دل ہی مانگے
اِس سے کم پر کسی قیمت میں بھی سودا نہ کرے

یہ عبارت کہ جو بے زِیر و زَبر لکھی گئی
وہی سمجھیں گے کہ جو زِیر و زَبر جانتے ہیں

اے کاش دل پہ ٹوٹ کے دل بھی کسی کا آئے
کیا دل پہ ٹوٹنے کو قیامت ہی رہ گئی

جنوں کے مارے ہوئے تیغ سے گلے مِل کر
کسی سے وصل کی حسرت تمام کر کے چلے

جلا ہی دے گی جہاں آگ سے لپٹ کر آگ
مثالِ آب اگر مَیں ہی درمیاں نہ رہا

گلے لگی ہے مِرے موت جب سے اُس دم سے
غمِ حیات و فراقِ گزشتگاں نہ رہا

اُس نے پہنا تو اُس کے قامت پر
جامۂ حسن بے شکن آیا

نُور ہی نُور تھا بدن اُس کا
سب کا سب پیرہن سے چھن آیا

دل مِرا غیب، عقل میری شہود
کیسی یاں وحی کیسا یاں الہام

وجہِ پیدائی حقیقت ہے
کچھ اگر ہے حقیقتِ اوہام

کہاں سے لائیے دل اہتمام کرنے کو
خموشی چاہیے اُس سے کلام کرنے کو

بہت ہجوم سہی تیرے آس پاس مگر
کھڑے ہیں گوشے میں ہم بھی سلام کرنے کو

اِسی پہ اپنے روز و شب کا اختتام کر لیا
جو راستے میں مل گیا اُسے سلام کرلیا

کھُلی ہیں جب سے ذہن پر خلا کی راہداریاں
کبھی خموش ہورہے کبھی کلام کرلیا

لیے لیے پھرے بہت کتابِ جاں کا انتساب
کوئی نہیں ملا کہیں تو اپنے نام کرلیا

رو بہ رو تیرے یہ ابرو نہیں بدلا میں نے
جب سے بیٹھا ہوں یہ پہلو نہیں بدلا میں نے

دل کی حالت شام ہوتے ہی بگڑ جاتی ہے روز
اور مِری وحشت بڑھانے روز آجاتی ہے شام

قیمتِ عشقِ زلیخا نہیں معلوم مگر
حُسنِ یوسفؑ ہے ٹکے کا جو زلیخا ہی نہ ہو

آج رخصت ہے تمنّا کی مگر یہ مِرا دل
ایسے خاموش ہے جیسے کبھی دھڑکا ہی نہ ہو

تیر وہ ہے کہ جگر سے نہ نکالے نکلے
زخم وہ ہے کسی مرہم سے جو اچھا ہی نہ ہو

ہونا تھا تو ہونا تھا کسی صاحبِ دل کو
اے عشق بتا تو مجھے کیوں ہوگیا آخر

عجب ہے عشق عجب عشق کی اذیّت ہے
نہ رُک رہا ہے وہ خنجر، نہ کٹ رہا ہے گُلو

شکستگی سے یہ دیوانگی بڑھے تو بڑھے
بہار تو نہیں آئے گی توڑنے سے سبو

یہی ہُوا کہ ہُوا دامِ بے دلی کا شکار
نہیں تھا دل پہ کسی طَور بھی کوئی قابو

آپ اپنے سے جو نہیں واقف
کیا بتاؤں اُسے کہ کیا ہوں میں

یہ تو اک عمر میں کُھلا مجھ پر
اپنے سائے میں پل رہا ہوں میں

وائے شہرِ بے سماعت ہائے سنتا ہے کوئی
مر گیا مَیں آہ میں پیدا اثر کرتے ہوئے

اب تو کرلیجے سماعت آپ قصّہ عشق کا
آہ تک لے آئے ہیں ہم مختصر کرتے ہوئے

دب نہ پائے گی یہ درباری اذانوں سے بھی
ہم جو اک سب سے الگ اپنی صدا رکھتے ہیں

تم بجز خوفِ خدا رکھتے ہو سب کچھ اور ہم
کچھ نہیں رکھتے مگر خوفِ خدا رکھتے ہیں

مجھ عشق کے گھائل کو اقامت کی نہ تھی تاب
جب اٹھ نہ سکا طوف کو در چل کے خود آیا

یہ کس سوال میں اٹکے ہوئے ہیں ہم اے دل
یہ کیوں نکلتی نہیں جان کیا ہُوا ہے ہمیں

جس گھر نیاز دے کے نکالا ملا ہمیں
یہ بت وہیں سے نازِ بتاں لے کے آئے ہیں

کوئی بتاؤ ہمیں یہ جہاں بھی کچھ بدلا
کہ خود بدل گئے ہم یہ جہاں بدلتے ہوئے

ہے کون سا کہ جو ہم پر ستم کیا نہ گیا
ستم! جو ہم پہ بنامِ کرم کیا نہ گیا

دلِ گرفتہ میں یوں بے دلی نے جا کر لی
کہ مجھ غریب سے اپنا بھی غم کیا نہ گیا

ہَوا ہی ساتھ اگر دے سکے تو دے ورنہ
غبار ہوگئے جب ہم تو کیا اٹھائے کوئی

اگر ہوں جیب و گریبان و دامن و دل چاک
کہاں کہاں سے یہ وحشت بھلا چھپائے کوئی

ہمارے آئنے میں تو بس اپنے حسن کو دیکھ
ہمارے نالہ و فریاد و ہاؤ ہُو پہ نہ جا

ہم تو اِک عشق میں ہر کام بھُلائے ہوئے ہیں
کارِ دنیا اِسی بگڑی نے بنائے ہوئے ہیں

جس جہاں میں ہے زمانے کو تلاشِ مرہم
ہم ترے زخم کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں

یہ جو سائے میں لگے بیٹھے ہیں دیوار سے ہم
کسے معلوم کہ دیوار اٹھائے ہوئے ہیں

ایک وحشت ہمیں اِس بزم میں لے آئی ہے
ہم نہ آئے ہوئے ہیں اور نہ بلائے ہوئے ہیں

کِس نَوشتے کی طرح خود کو پڑھیں ہم آخر
ایسے لکھّے ہوئے ہیں جیسے مٹائے ہوئے ہیں

ساتھ رونے نہیں آ جاتے ہیں سب پونچھنے اشک
ہم کہاں جائیں جو دنیا کے ستائے ہوئے ہیں

ہوئے زمانہ ہُوا بزمِ ہاؤ ہو برہم
جُدا صراحی صراحی سبو سبو برہم

یہ کیوں نہیں ہے ٹھکانے پہ آج شام سے دل
میں بے حواس ہوں یا ہیں یہ چار سو برہم

ترے جلالِ تکلّم کے آگے کیا کہوں مَیں
مِری مجال تو یہ بھی نہیں بجا کہوں مَیں

جسے نہ جان سکوں اُس کو کائنات کہوں
جسے سمجھ نہیں پاؤں اُسے خدا کہوں مَیں

یہ دُکھ تو عقل کا دکھ ہے بیاں کروں کس سے
یہ دل کی بات نہیں جو ہر اک سے جا کہوں مَیں

کوئے طفلاں میں جو سر لے کے نکل آئے ہو
قابلِ سنگ یہ آشفتہ سری ہوگئی کیا؟

بُت تراشی میں وہ لذّت ہے نہ سجدے میں مزا
تھی ہنر میں جو مِرے بے ہنری ہوگئی کیا؟

بقا کی کھوج میں سرِّ فنا بھی کھودیا ہم نے
خدا تو کیا بنے ہم آئنہ بھی کھودیا ہم نے

حقیقت کی طلب میں وہم سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے
کہ قربت کی ہوس میں فاصلہ بھی کھودیا ہم نے

سمجھ بیٹھے تھے جس کو ہم خدا بس ایک خلا تھا وہ
اِدھر کچھ دن سے احساسِ خلا بھی کھودیا ہم نے

سوائے ہاتھ شل ہونے کے اپنے ہاتھ کیا آیا
کہ ''ہے'' بھی کھودیا ہم نے کہ ''تھا'' بھی کھودیا ہم نے

آئینے پر جمی ہوئی حیرت کو دیکھنا
کیا بار بار ایک ہی صورت کو دیکھنا

دانشورانِ وقت ہوں جب محوِ گفتگو
چُپ رہ کے درمیاں مِری وحشت کو دیکھنا

دبا سکا نہ صدا اُس کی تیری بزم کا شور
خموش رہ کے بھی کوئی صدا بنا ہُوا ہے

یہ کارِ عشق ہے رکھ اپنے انہماک سے کام
نہ دیکھ بگڑا ہُوا کیا ہے کیا بنا ہُوا ہے

تمہاری بزم میں حیرت سے ہے کوئی تصویر
کوئی ادب سے ہے ساکت، دیا بنا ہُوا ہے

پہلے کھولو تم اپنا بندِ حجاب
اک زرا کُھل کے پھر کُھلو صاحب

ہے یہی کچھ بہ نامِ آب و غذا
پیاس پیتا ہوں بُھوک کھاتا ہوں

یہ نوالہ کسے نصیب میاں
میں جو اپنا جگر چباتا ہوں

تیر و تلوارو مجھ پر ٹوٹ پڑو
زخم کھا کر میں لہلہاتا ہوں

عقل و نگاہ و دل کا تقاضا بدل گیا
آنکھیں تو کھول دیکھ زمانہ بدل گیا

تو جانے کِس گمان میں ہے کس خیال میں
دنیا کے سوچنے کا طریقہ بدل گیا

تو اب بھی رو رہا ہے اُسی جمع و خرچ کو
دنیا بدل گئی غمِ دنیا بدل گیا

انساں پہ اپنے ہونے کے اسرار کیا کھلے
مفہومِ حال و ماضی و فردا بدل گیا

اک روز میرے خواب کے مانند یہ جہاں
بدلے گا ، میں نہ کہتا تھا ، دیکھا، بدل گیا

حیرت کے دن گزر گئے وحشت بھی ہو چکی
اب کیا نیا کریں کہ محبت بھی ہو چکی

اب کیا نیا سوال کریں چشمِ یار سے
غفلت بھی ہو چکی ہے عنایت بھی ہو چکی

اب اور کیا ہے جس کا ہے اِس دل کو انتظار
اب ہو چکا ہے وصل بھی حسرت بھی ہو چکی

اب عقل کیا کرے کسے لائے خیال میں
اب آ گہی بھی ہوچکی غفلت بھی ہو چکی

اب جی بھی لیں تو کیا ہے جواب مر بھی لیں تو کیا
بے حالتی بھی ہو چکی حالت بھی ہو چکی

دل کی حسرت نے دل کی وحشت نے
کھالیا ہے چبا لیا ہے دل

جیسا درکار تھا محبت کو
ہم نے ویسا بنا لیا ہے دل

مَیں نے پُوچھا تھا پیار ہے کتنا
اُس نے شہہ رگ میں دانت گاڑ دیے

اپنے ہی سَر پہ مَیں دے مارتا ہُوں آخرِ کار
جب کبھی سنگ اُٹھاتا ہُوں مَیں پاگل پن میں

کوئی ہذیان اِسے کہتا ہے کوئی کہتا ہے وحی
یہ جو بولے چلا جاتا ہُوں مَیں پاگل پن میں

ہاں ہوگا نوؔید بھی کوئی شاعر
ہم نے تو یہ نام سُنا نہیں ہے

کوئی نہیں کہ مِلا ہو جو اُس سے مِل کر بھی
وہ دیکھ کر بھی نہ دیکھا ہُوا سا رہتا ہے

مَیں نے کیا جانا نہیں جانا اگر عالمِ ''ھُو''
مَیں نے کیا پایا اگر خود کو نہ پایا، کہ مَیں ہُوں

ہم کو معلوم نہیں تھا ہمیں ہو جائے گا عشق
ہم نے سوچا تھا سہولت سے گُزر جائیں گے ہم

مجھے تو سوچ کر یہ بات وحشت ہو رہی ہے
جسے دیکھا نہیں اُس کی عبادت ہورہی ہے

بنا دیکھے اُسے مانا نہ مانا جا رہا ہے
بہ نامِ دید توہینِ بصارت ہو رہی ہے

جسے دیکھو وہ دَوڑا جا رہا ہے غیب کی سمت
یہ نشّہ کون سا ہے کیا ریاضت ہو رہی ہے

ستم یہ ہے حقیقت کے گلے پر رکھ کے خنجر
خدا وندا تصور کی عبادت ہو رہی ہے

ٹھکانے لگ گئے اقرار اور انکار والے
یہاں ہر سانس صرفِ بے دریّت ہو رہی ہے

خامشی سے ہوئی تھی بات شروع
خامشی پَر ہی ختم ہوگئی بات

بعد میں سوچیے کہ ''ھُو'' کیا ہے
پایئے پہلے ماء و تو سے نجات

ہاں بس ہَوا نے کھینچ لیا پردۂ حجاب
موجود خود چراغ کی لَو میں تھی موجِ دود

جنوں میں ہم نے گُزاری ہے کتنی بے رنگی
ترے جہان میں ہم رنگ بھر گئے تو کھُلا

یہی جواز تھے جینے کا اور مرنے کا
ستم تو یہ ہے کہ جب زخم بھر گئے تو کھُلا

نہ جیتے یوں تو ستائش کی مَوت مَر جاتے
گُزر کے بات سے جب بات کر گئے تو کھُلا

آج سے ہم خدا کے بارے میں
خامشی اختیار کر رہے ہیں

باز کب آرہے ہیں عشق سے ہم
غلطی بار بار کر رہے ہیں

اب کہاں کا ہجر کاہے کا وصال
اب تو ہم وحشت کے عادی ہوگئے

''ہے'' اور ''نہیں'' کا آئینہ مُجھ کو تھما دیا گیا
یعنی مِرے وجود کو کھیل بنا دیا گیا

میرا سوال تھا کہ میں کون ہُوں اور جواب میں
مجھ کو ہنسا دیا گیا مجھ کو رُلا دیا گیا

میرے جنوں کو تھی بہت خواہشِ سیر و جستجو
مجھ کو مُجھی سے باندھ کر مجھ میں بٹھا دیا گیا

نَیں نے کہا کہ زندگی، درد دیا گیا مجھے
مَیں نے کہا کہ آگہی، زہر پلا دیا گیا

خواب تھا میرا عشق بھی خواب تھا تیرا حُسن بھی
خواب میں یعنی ایک اور خواب دکھا دیا گیا

ہزار رایت و پرچم بہت نشان و علم
ہے جس کے پاس خبر بے نشاں پڑا ہُوا ہے

مَیں وہاں کہنا چاہتا ہُوں کُچھ
جہاں جائے کلام ہے ہی نہیں

سُن یہ قَد قامتِ الصّلوٰۃ سے کہہ
سجدہ اُٹھنے کا نام ہے ہی نہیں

مجھ کو آنکھیں دِکھا رہا ہے کیا
میرے منہ میں لگام ہے ہی نہیں

کیا اشارے سے حَد میں آئے گا
جس کا کوئی مقام ہے ہی نہیں

''ھُو'' کا ہے یہ سفر جنابِ مَن
اِس سفر میں قیام ہے ہی نہیں

ایسی بھی کیا ہے بے دلی صاحب
بے دِلی کا ملال تو کیجے

کتنی بے مِثل ہے نزاکتِ حُسن
پیش کوئی مثال تو کیجے

جو کہے گا وہ، مان لیں گے آپ
اجی کچھ قیل و قال تو کیجے

مسئلہ میرا ہے مجھ کو ہے حقیقت کی تلاش
میں مروں یا کہ جیوں آپ کا کیا جاتا ہے

بے نیازی ہے جتانا تو خدا سے ملیے
ورنہ انسان سے تو جُھک کے مِلا جاتا ہے

ذکر جب چھڑتا ہے اُس چشم کے بیماروں کا
یہ بتاؤ کہ مِرا نام لیا جاتا ہے

مَیں نہ انکار نہ اقرار مِرا کیا ہوگا
راندۂ کفر ہُوں اسلام سے نکلا ہُوا ہُوں

کر دیا دل میں ''ھُو'' کا سنّاٹا
یا صحیفہ کوئی اُتار دیا

اِس قدر بھی میں بے جواز نہ تھا
کیوں مجھے میرے مُنہ پہ مار دیا

دل دیا بھی تو کیا دیا تُو نے
اے خُدا جب نہ اختیار دیا

چار و ناچار و نامُراد و مُراد
وقت جیسا بھی تھا گُزار دیا

معبد و بُت کدہ و مسجد و میخانہ و دیر
لوگ جاتے ہیں جدھر آپ اُدھر کیوں نہ گئے

کفر و ایماں تو درِ دیر و حرم پر ٹھہرے
آپ کافر نہ مسلمان گُزر کیوں نہ گئے

کس سے کہیے کہ ہے کیا حالِ دلِ آوارہ
کون سمجھے گا کہ گھر جاکے بھی گھر کیوں نہ گئے

اِتنی یکسوئی جناب اِتنا تنوّع توبہ
مُنتشر کیوں نہ ہوئے آپ بکھر کیوں نہ گئے

کسی ہَوا میں نہ آنا کہیں نہیں جانا
چراغ گھر میں جلانا کہیں نہیں جانا

ہزار عقل کی گھاتیں ہزار عشق کے دام
کوئی فریب نہ کھانا کہیں نہیں جانا

یہ چھوٹی چھوٹی سی خوشیاں یہ چھوٹے چھوٹے سے غم
انہی میں دل کو لگانا کہیں نہیں جانا

تمہیں جہاں کہیں جانا ہے جاؤ دیدہ ورو
مجھے کہیں نہیں جانا کہیں نہیں جانا

نہ مَے کدہ نہ حرم اور نہ دیر و بت خانہ
مجھے ہے ہوش میں آنا کہیں نہیں جانا

مَوت بھی پڑ گئی کم عشق میں مرنے کے لیے
پڑ گیا وصل بھی کم ایسا کچھ ارمان کیا

ہجر میں جینا تھا اور وصل میں مرنا تھا مجھے
مرحلہ عشق کی مُشکل نے ہی آسان کیا

آپ کو بھی کوئی آزار لگا جیتے جی
اپنے ہونے نے بہت ہم کو تو ہلکان کیا

جان لیتے ہیں جو دُنیا کی حقیقت کیا ہے
اپنی کہتے نہیں کچھ سب کی سُنا کرتے ہیں

نہیں آتی، مگر آتی ہے متانت اُن میں
جو تحمّل سے ہر اِک بات سُنا کرتے ہیں

آپ بے موت ہی کیوں گڑ گئے خاموشی سے
مرنے والوں کے جنازے تو اُٹھا کرتے ہیں

اور ہے دنیا پہ کرنا لعن طعن
اپنی اِک دنیا بسانا اور ہے

اور ہے ناکامیوں سے لینا کام
فتح کے دھوکے میں آنا اور ہے

اور ہے مشغول رہنا کام میں
بیٹھ کر باتیں بنانا اور ہے

اور ہے پی کر بھی رہنا ہوش میں
بن پیے ہی لڑکھڑانا اور ہے

اور ہے رہنا زمیں پر بن کے بوجھ
بارِ ہفت افلاک اُٹھانا اور ہے

اور ہے رونا اندھیرے کو نوؔید
اک چراغ اپنا جلانا اور ہے

کر کے خود اپنی آڑ بیٹھ گئے
ہم تو سب چھوڑ چھاڑ بیٹھ گئے

اُس نے کیا دیکھا بے نیازانہ
ہم بھی دامن کو جھاڑ بیٹھ گئے

دیکھتے دیکھتے ہی اے حسرت
کیسے کیسے پہاڑ بیٹھ گئے

کیا دِکھاتے ہم اختیارِ جنوں
بس گریباں کو پھاڑ بیٹھ گئے

کچھ نظر آئے یا نہ آئے نظر
ہم تو نظروں کو گاڑ بیٹھ گئے

ہے راز پسِ راز ہے پردہ پسِ پردہ
اِس راز سے ہم پردہ اُٹھانے چلے آئے

موت کی تفہیم کو کب آگہی سمجھا گیا
آمد و رفتِ نفس کو زندگی سمجھا گیا

اور ہی نکلے مفاہیمِ صراط المستقیم
جب ہماری گمرہی کو راستی سمجھا گیا

بندگی تیری سراسر کافری پائی قرار
جب ہماری کافری کو بندگی سمجھا گیا

اُس کے پردے سے ہی نکلیں گے خدا و اہرمن
دیکھ لینا تم جو انساں کو کبھی سمجھا گیا

کیوں نہ فرشِ عشق پر میں عقل کا ماتم کروں
تھی وہ سیرابی کہ جس کو تشنگی سمجھا گیا

دانشِ حاضر پہ روؤں یا ہنسوں میں، جب مجھے
صوفی گردانا گیا اور فلسفی سمجھا گیا

چُپ رہا جب تک تو بُت اندر خدا تھا میں نوؔید
بات کی میں نے تو مجھ کو آدمی سمجھا گیا

ورائے اوّل و آخر یہ مسئلہ ہے وہیں
خیال ہم سے ہے یارب کہ ہیں خیال سے ہم

پَسِ وجود بہت بحثِ نقل و اصل ہوئی
مگر ہوئے نہیں ثابت کسی مثال سے ہم

میانِ وہم و حقیقت، میانِ شکّ و یقیں
خود اپنے واسطے ہیں ممکن و محال سے ہم

جواب بعدِ سوال اور سوال بعدِ جواب
چُھڑائیں جان تو کس طرح اِس و بال سے ہم

کرتا تو کیا یہ ہم پہ حقیقت کو آشکار
اِس وہم نے فریب بھی کھانے نہیں دیا

نیا زمانہ آنا ہے دُنیا کو آگے جانا ہے
بربادی ایک بہانا ہے دُنیا کو آگے جانا ہے

شبنم کو شعلہ لکھنا ہے ماضی کا نوحہ لکھنا ہے
فردا کا نغمہ سنانا ہے دُنیا کو آگے جانا ہے

جو تخلیق کا مقصد ہے جو تحقیق کا مقصد ہے
اُس مقصد کو پانا ہے دُنیا کو آگے جانا ہے

سّیارے نئے بسانے ہیں نئے چراغ جلانے ہیں
فرش کو عرش بنانا ہے دُنیا کو آگے جانا ہے

بات یہی دہرانی ہے آج کی کل تو آنی ہے
بس اِیک قدم اُٹھانا ہے دُنیا کو آگے جانا ہے

اے خدا خیر سب جہانوں کی
آج گھبرا رہا ہے دل میرا

کتنا بھُوکا ہے یہ مُحبت کا
مجھ کو ہی کھا رہا ہے دل میرا

زخم و مرہم کے اِس تماشے سے
اب تو اُکتا رہا ہے دل میرا

دین و دُنیا کا چھیڑ کر قصّہ
مجھ کو بہلا رہا ہے دل میرا

پھیلتی جا رہی ہے شام نوؔید
ڈوبتا جا رہا ہے دل میرا

دل چلا جائے تو رہ جاتی ہے حسرت لیکن
دل سے حسرت ہی چلی جائے تو کیا رہتا ہے

اپنی تنہائی مَیں اے کاش سلامت لے جاؤں
زندگانی ترِا مِیلا تو لگا رہتا ہے

درد کا دل کو جو اک بار مزا لگ جائے
کون کافر ہے جو پھر اِس کی دوا کرتا ہے

دل بھی کچھ کرتا ہے، کچھ بس میں ہے اِس کے بھی کہ بس
تانا بانا ہی تصوُّر میں بُنا کرتا ہے

دل تو دیوانہ ہے سمجھایئے کیا اِس کو کہ یہ
سب کی سُنتا ہے مگر اپنی کیا کرتا ہے

سوچتا ہُوں اگر نہ کرتا عشق
صبح کو کیسے شام کرتا مَیں

عشق ہے یہ کروں تو کیا صاحب
کام ہوتا تو کر گُزرتا مَیں

زباں نہ کھول ترا دل اگر دُکھا ہُوا ہے
یہ قصّہ سب نے کئی بار کا سُنا ہُوا ہے

خُدا تراش ہیں آدابِ بندگی اپنے
وہ بُت ہمارے ہی سجدے سے تو خدا ہُوا ہے

کہیں ہنگام ہے ''ہے'' کا، ہے ''نہیں'' کا کہیں شور
وہی خاموش ہے جو ''ہے'' کہ ''نہیں'' جانتا ہے

نہ خطّ و خال سے آزاد کر سکا اُسے حُسن
مجھے تو عشق نے بے خدّ و خال کر دیا ہے

کہیں ٹھہرنے بھی دے مجھ کو وہمِ شعبدہ باز
ہر اِک جواب کو تُو نے سوال کر دیا ہے

تو کیا فطرت نے مجھ کو اِس لیے بخشی ہے تنہائی
کہ اِس تنہائی سے کوئی خدا ایجاد کرلوں مَیں

توقف کر، ٹھہر، ہنگامہء دیر و حرم دَم لے
کہاں بھول آیا ہُوں خود کو زرا یہ یاد کرلوں مَیں

مجنوں کو جنوں میں جہاں لیلیٰ کی پڑی ہے
''کیوں'' کی ہے ہمیں فکر، ہمیں ''کیا'' کی پڑی ہے

یہ عقل بھی تو بُت ہی بنانے میں ہے مصروف
گر عشق میں یوسفؑ کو زلیخا کی پڑی ہے

ہے عقل جُدا حسرتِ عالمِ امکاں
اور دل کو الگ اپنی تمنّا کی پڑی ہے

اے دیدہ ورو دَیر و حرم تُم کرو آباد
ہم کو تو کسی اور ہی دُنیا کی پڑی ہے

کس وہم سے گوندھا ہے حقیقت کو خُدا نے
جس قطرے کو دیکھو اُسے دریا کی پڑی ہے

کون سمجھے گا مِری شکل میں ظاہر ہو کر
خود ہُوا ہے کہ مُجھے اُس نے تماشا کیا ہے

ہم ہیں درویش ہمیں اور تو کیا کرنا ہے
سب کو دینا ہے دُعا سب کا بھلا کرنا ہے

روز اُٹھنا ہے جگانا ہے مُجھے سُورج کو
اک خُدا ہے جسے ہر روز نیا کرنا ہے

وہ جو اک شخص تماشے میں نہیں ہے موجود
مجھ کو اُس شخص کا کردار ادا کرنا ہے

ایک ہی فیصلہ کیا ہم نے
یعنی کوئی بھی فیصلہ نہ کِیا

کُچھ کہو اور نہ کُچھ سنُو صاحب
بس کہ تصویر ہو رہو صاحب

کر رہا ہے سُکوت تُم سے کلام
ہمہ تن گوش ہو رہو صاحب

وہ خموشی ہو درمیاں اے کاش
دل کہے اور تم سُنو صاحب

ہے اگر تُم کو سَیر کی خواہش
کسی کو نے سے جا لگو صاحب

نغمہ و نوحہ بے اثر ہوں جہاں
چُپ نہ ہو چیخنے لگو صاحب

پہلے کھولو تم اپنا بندِ حجاب
اک ذرا کُھل کے پھر کُھلو صاحب

حجت اپنی یہاں تمام ہُوئی
اب اُٹھو اور بس چلو صاحب

جنوں کو اِذنِ بیانِ جنوں مِلے تو سہی
سوال ہم بھی اُٹھائیں گے حشر اُٹھے تو سہی

چھُڑا کے شانہ سبھی جا رہے ہیں سوئے بقا
فنا کی کس سے مَیں پُوچھوں کوئی رُکے تو سہی

یہی کہ ہم بھی ٹھہر جائیں گے کہیں نہ کہیں
مگر کہیں کی ہمیں کوئی حَد مِلے تو سہی

وہ بھول جائے گا ہنگامہ ہائے حرف و عدد
کلامِ خامشیِ ''ھُو'' کوئی سُنے تو سہی

گُزار دیں گے اُسے ہم وُجوب و امکاں سے
ہمارے ساتھ کوئی دو قدم چلے تو سہی

بلا سے چاہے نکل آئے پھر اک اور گرہ
ابھی جو سامنے ہے وہ گرہ کھُلے تو سہی

تو کیا خموش رہوں شرحِ کارِ دل نہ کروں
تو کیا حکایتِ سود و زیاں سناؤں مَیں

عجیب کام مِلا ہے کہ مہربانوں کو
بٹھا کے قصّۂ نامہرباں سناؤں مَیں

نہ ''میں'' ہے نہ ''تُو'' ہے
فقط ایک ''ھُو'' ہے

یہاں ملتا ہے بس اُسی کا پتا
جس کا کوئی پتا نہیں ملتا

وہ راستی بھی ہے کیا عقل کو جو کُند کرے
کرے جو ذہن کُشادہ وہ گُمرہی لاؤ

کسی کا حُسن ہے کہتا جھکاؤ نظروں کو
کسی کا حُسن ہے کہتا پلک نہ جھپکاؤ

ہر اک دلیل کیے جا رہا ہے قطع نوؔید
خُدا کے واسطے مُنہ اِس کا بند کرواؤ

ستم یہ ہے مَیں خود اپنا خلا ہُوں سینے میں
جو زخم ہوتا تو مرہم سے بھر ہی جاتا مَیں

پسِ خبر نہیں ملتی جو مجھ کو بے خبری
تری خبر کی قسم بے خبر ہی جاتا مَیں

بس یہی ایک کام کرتے ہیں
صبح کو روز شام کرتے ہیں

کرتے ہیں دستِ حُسن پر بیعت
دل کو اپنا امام کرتے ہیں

دل میں اب کچھ نہیں سوائے خلش
یہ بھی ہم تیرے نام کرتے ہیں

صاحبانِ نمود و نام کو ہم
دُور ہی سے سلام کرتے ہیں

جانتے ہیں جو قدر و قیمتِ وقت
کچھ نہیں کرتے کام کرتے ہیں

چھڑ گیا تارِ سازِ نغمۂ ''ھُو''
گفتگو کو تمام کرتے ہیں

جس طرف دل کی کوئی بھی سنتا نہیں
اُس طرف بھی صدا ہم کیے جائیں گے

ہے یہی کچھ جو بس میں ہمارے سو ہم
کام ناکامیوں سے لیے جائیں گے

کیا کریں لے کے عمرِ مسیحاؑ و خضرؑ
مر نہ جائیں گے ہم گر جیے جائیں گے

جو ہے جی میں تمہارے کہے جاؤ تم
ہم بھی اپنی سی کرنی کیے جائیں گے

مِل کے خوش ہوتا ہے ہر اک مغموم
جانے اُس سوگوار میں کیا ہے

جانے غفلت کا کرشمہ ہے کہ آگاہی کا
زندگی پردے اٹھاتی ہی چلی جاتی ہے

اے طائرِ فریفتہ پرواز، ہوشیار!
جز وہم پاس دامِ حقیقت کے کچھ نہیں

زمانے لے اُڑا ہو گا، اُسے جبریل سوئے عرش
جو مصرعہ ہوگیا ہوگا، تو آیت ہو گئی ہوگی

کسی خلوت میں تم نے لوحِ دل کو جب پڑھا ہوگا
سمجھ لو میرے دیواں کی، تلاوت ہوگئی ہوگی

تمہیں، تم مل گئے ہوگے، جومصرعہ کُھل گیا ہوگا
زیارت ہوگئی ہوگی، عبادت ہوگئی ہوگی

چھپی نہ شرم سے بھی، یاں ہماری عریانی
کسی کے ننگ کو حسرت، کہ نام بھی نہ کیا

ہے کوئی! جو سنتا ہو، شبِ تیرہ کی فریاد
یہ رات، سنورنے کو دِیا مانگ رہی ہے

کر ہی دے گا، وہ بے سوال تمہیں
سب سوالات، جس سوال میں ہیں

لگ رہے ہیں، جو بے خیال سے آپ
کچھ تو کہیے کہ کس خیال میں ہیں

ثبوتِ وہم میں ہر گز نہ لا حقیقت کو
بیان کرنے کو ممکن، محال پر مَت جا

میں تیرے عشق میں خود بن گیا ہوں تُجھ جیسا
مگر میں کون ہوں میری مثال پر مَت جا

خود تو جا کر ہوگیا گُم وقتِ نا معلوم میں
کارواں نے بس غبارِ کارواں پیدا کیا

در حقیقت وہ ترا وہم بھی ہوسکتا ہے
جس کو تُو عشوہ و اندازو ادا سمجھا ہے

جنون، عقل، خرد، جذب، عشق، مستی، ہوش
کسے خبر ہے کہ کیا ہے ہماری تنہائی

زلفِ ہزار پیچ میں اٹکا ہے جا کے خود
کیا ہے اگر نہیں یہ مِرے دل کی سادگی

ممکن پہ کر کے گفتگو امکاں کی بحث چھیڑ کر
میں بھی محال ہوگیا تم بھی محال ہوگئے

''میں'' سے لے کے ''تُو'' تلک ''تُو'' سے لے کے ''میں'' تلک
میں ہوں آپ ہی جواب میں تھا آپ ہی سوال

ہے شمع شعلے میں گُم اور شعلہ دُود میں گم
یہ بود نیست میں گم ہے کہ نیست بود میں گم

مگر میں کون ہوں اور کیا ہیں یہ زمان و مکاں
میں اِن میں قید ہوں یا یہ مِری حدود میں گم

اِس جہاں کو گو میں سمجھا تھا زمیں تا آسماں
وسعتِ امکانِ آدم پر کہاں سمجھا تھا مَیں

غور سے دیکھا تو یاد آئی خود اپنی طرزِ ترک
یونہی طرزِ ما کو طرزِ دیگراں سمجھا تھا میں

بیدِ مجنوں بھی سرِ صحرا ہے بیضائے کلیم
رازِ خاموشیِ محمل دم بہ دم ہے جس سے فاش

خامشی نے توڑ دیں شاید کہ زنجیریں تمام
تھا بہت زنجیر کے غُل سے قفس میں ارتعاش

تابہ جاں دب کر تہہِ سنگِ گرانِ روزگار
الاماں تک آگئی ہے اِک صدائے دلخراش

اس نے دل پر نیزۂ شامِ تغّیر کھا لیا
پر تنِ صبحِ تغیّر پر نہ آنے دی خراش

گر عشق کو مکتب میں ملے عقل کی تعلیم
اور عقل کو مکتب میں ملے عشق کا مضمون

پھر کوئی بتاؤ مجھے مکتب سے نکل کر
مجذوب نہ کیوں عشق نہ کیوں عقل ہو مجنون

خدا بھی بن کے نہ کیا کیا رہی ہے بےتسکین
خودی کو بھی نہیں معلوم انا کی حد کیا ہے

کیا کھویا ہے ہم بے خبروں کا نہیں معلوم
کیا ڈھونڈ رہے ہیں کہ جو مِلتا نہیں کچھ بھی

اے دل یہاں جب تک مِرا ہونا نہ ہو ثابت
واللہ کسی بات کا ہونا نہیں کچھ بھی

خامشی باطن میں پوشیدہ خلا ظاہر میں ہے
جانیے کیا اِس سے کیا باطن میں کیا ظاہر میں ہے

ایک ہیں باطن میں اپنے یہ زماں اور یہ مکاں
اِس زماں سے یہ مکاں ویسے جدا ظاہر میں ہے

یکسانی سے اِس شوق کی وہ حال ہُوا ہے
سودا بھی تِری زلف کا سودا نہیں لگتا

تہہ میں مجھے کیا چھوڑ گئی تنُدیِ امواج
مدت ہوئی دریا مجھے دریا نہیں لگتا

دل میں کچھ کچھ ابھی باقی ہے مِرے دل کی سی بات
درد ہوتا ہے تو لگتا ہے کہ ہاں ہوتا ہے

ایسا ہنگامہ ہُوں خود مجھ کو نہیں جس کی خبر
پوچھتا پھرتا ہُوں یہ شور کہاں ہوتا ہے

وہ کشاکش ہے کہ آتا ہے نہ رکتا ہے یہ دم
کبھی کرتا ہُوں 'نہیں' اور کبھی 'ہاں' کرتا ہُوں

نہ گُل میں گُل نہ خزاں میں خزاں نہ ابر میں ابر
یہاں تو رہ کے بھی گویا نہیں رہا ہے یہ دل

کسے معلوم کیا ٹھہرا ہُوا ہے کیا رواں ہے
زماں زیرِ مکاں ہے یا مکاں زیرِ زماں ہے

چلا آتا ہے گُل کے بعد گُل پیہم مسلسل
چمن ہے یا یہ کوئی موجۂ آبِ رواں ہے

مسلسل ہے صدائے کُن جہانِ نَو بہ نَو میں
نہ اوّل ہے نہ آخر ہے نہ کوئی درمیاں ہے

ترے گاہک فرشتے اور مرا گاہک بس اک میں
ترا بازار وہ ہے اور یہ میری دکاں ہے

تُو خنجر آزمائے اور مَیں دل آزماؤں
وہ تیرا امتحاں ہے اور یہ میرا امتحاں ہے

شامل ہُوں میں بھی سیلِ فنا میں بہ شکلِ موج
یہ بھی ہے اِک نشاں کہ نشاں کوئی بھی نہیں

قامت سے کھینچتا ہُوں زمان و مکاں کا قد
سمجھو کہ مَیں نہیں تو یہاں کوئی بھی نہیں

لَوٹ آئے اہلِ عشق یہ بازار گھوم کر
جو چاہیے ہے اُس کی دکاں کوئی بھی نہیں

باز آیا آئینے سے، یہ کہتا ہُوں اب تو بس
منہ دیکھنے کو آئنہ دیکھا کروں گا مَیں

صحرا کو جس خیال سے بستی بناؤں گا
بستی اُسی خیال سے صحرا کروں گا مَیں

بے معنیِ جہاں کو ہے کیا کیوں لگی ہے ساتھ
معنی تو اپنے واسطے پیدا کروں گا مَیں

پردے کے اُٹھنے پردے کے گرنے کے درمیاں
تم دیکھنا کہ کوئی تماشا کروں گا مَیں

یہ نہ پوچھو کیا نہ سمجھا اور کیا سمجھا تھا مَیں
کچھ نہ سمجھا تو اُسے اپنا خدا سمجھا تھا مَیں

دنگ ہوں جب سے ہوا کی کارفرمائی کھُلی
سانس لینے کو ہَوا کی انتہا سمجھا تھا مَیں

میں تو سمجھا ہُوں قیامت اِک ہنسی کا نام ہے
تم پہ جب گزرے گی سمجھو گے بجا سمجھا تھا مَیں

اُس بزم میں بھی اپنی ہی خلوت میں رہے ہیں
آئینہ تھے آپ اپنی ہی حیرت میں رہے ہیں

اِک پَل کو سر اُٹھا بھی نہیں کارِجنوں سے
کیا جانیے کس طرح کی فرصت میں رہے ہیں

اے عشق تِری حدِّ خدائی کو بھی چُھولیں
اب دن ہی یہاں کتنے قیامت میں رہے ہیں

رکھا نہیں تکیے پہ سر اِک پل کو سَرا میں
اِک شب کے مسافر بڑی عجلت میں رہے ہیں

روک لیتا ہوں نکلتی ہوئی گالی پسِ لب
آسماں اِس سے زیادہ مِرے امکاں میں نہیں

جتنا ساماں تھا اکٹھا وہ لگا کاٹھ کباڑ
جب یہ دیکھا کہ مِری عمر ہی ساماں میں نہیں

ایسا ہے کہ اُس انجمن آرا کا تکلّف
دیکھیں گے کسی روز جو خلوت میں ملیں گے

محفل میں ہم سے قصۂ بربادیِ حیات
وہ کہہ رہا ہے ہائے جو برباد بھی نہیں

کیا مسافت ہے کہ صحرا بھی نہیں دُور تلک
مجھ سے کہتے تھے کہ اِس راہ میں گھر آتا ہے

چشمِ بیتاب ذرا صبر کہ وہ منظرِ جاں
جب نظر کچھ نہیں آتا تو نظر آتا ہے

ایسی خلوت ہے کہاں آئنہ حیراں ہے بہت
کوئی جاتا ہے کہیں جا کے سنور آتا ہے

کائنات اور ہے کچھ اور کہ یہ ہنگامہ
نہ تو کرنے سے ہُوا اور نہ ہُوا ہونے سے

اپنی ہی شعلہ نوائی سے نہ جلتا اے کاش
روکتا کوئی مجھے شعلہ نوا ہونے سے

نکلی نہ دل سے حسرتِ دل، گھُٹ گئی یہ جاں
چھاتی پہ ایک سِل سی ہمیشہ دھری رہی

برسا وہ ابرِ وصل کہ بوندوں کے شور سے
تادیر میرے دل میں عجب تھرتھری رہی

مِرا جنوں جو گریباں کے ہوش سے گُزرا
نہیں رہا ترے جلوے کو بھی نقاب کا ہوش

وہ بکھیرا ہے جو سمٹے نہ سمٹ پائے گا
وہ سمیٹا ہے کہ جو ہے ہی بکھر جانے کو

جانے آئے تھے کدھر سے وہ کدھر جا پہنچے
وہ جو نکلے تھے نہ معلوم کدھر جانے کو

کیا کہوں عالمِ بے تابیِ تصویر کہ بس
رنگ بے چین ہیں تصویر میں بھر جانے کو

حُسنِ عُریاں ہو تو پھر عشق میں رکھّا کیا ہے
یہ تجسس ہے فقط بندِ قبا رکھنے سے

پیدا ہوئے ہیں خار بھی اے گردشِ نمود
مجھ میں فقط گلاب ہی پیدا نہیں ہوا

اِک جا کیا نازک مجھے شیشے سے زیادہ
اِک جا کیا پتھر تری بے داد گری نے

ملی اُسے بھی کلیدِ نشاطِ روح و نفس
اُسے بہار سے لیکن مجھے خزاں سے

ملی اُسے بھی کلیدِ وجود و عشق مگر
مجھے زمیں سے ملی اُس کو آسماں سے ملی

جو خلوت کو گزار آئے ہیں یہ ہے انجمن اُن کی
یہاں وہ مل کے بیٹھے ہیں جو یکتائی سے گزرے ہیں

گھر میں سوئی ہوئی ویرانی جگادی اُس نے
اور ہوتا بھی بھلا حسرتِ تعمیر سے کیا

اِسی تلاش نے بے رنگ کردیا ہے مجھے
وہ رنگ کیا ہے کہ جس سے بنے سپید و سیاہ

کہاں کے دَیر و حرم اور کہاں کے بادہ و زلف
اگر ملی تو بالآخر مجھی میں مجھ کو پناہ

رگِ گلو سے میں خنجر کو کاٹ سکتا تھا
یہ اختیار تھا صبر اختیار کرتے ہوئے

جو اِس کنارے پہ 'مَیں' تھے نہ اُس کنارے پہ 'تُو'
وہ خود میں ڈوب گئے خود کو پار کرتے ہوئے

یہ تیرے زرد رُو عریانِ شمشیر کے عاشق
ہزار انداز سے اک منّتِ قاتل اٹھاتے ہیں

ہاتھ اُس نے رکھا دل پہ اور آہستہ سے پوچھا
جو دل میں ترے درد تھا اب ہے کہ نہیں ہے

پوچھ بیٹھا ہے پھر کوئی مِرا حال
چشم سے پھر نہ خوں رواں ہو جائے

اے خالقِ حیات! تو کیا مَوت کے لیے
احسان زندگی کا اُٹھانا پڑا مجھے

قصّے سے اُٹھ نہ جائے کہیں قصّہ گو کا دل
رونا پڑا مجھے کبھی ہنسنا پڑا مجھے

اے میرے بے نیاز نہ تجھ کو خبر ہوئی
مَر مَر کے تیرے عشق میں جینا بھی ہوگیا

جب یہ دن جاگا تو میں پاپتی سویا اپنے
رات جب سوئی تو میں اپنے سرہانے سے اُٹھا

پردۂ عَجز میں لیلیٰ نے چھپایا مُنہ کو
وزن دیدار کی مِنّت کا دِوانے سے اُٹھا

شعلہ مرہونِ طلب ہے جو یہ پردہ اُٹھ جائے
طلبِ شعلہ ہے پروانے کو پرَ سے پہلے

اک جہاں مجھ سے خفا ایک زمانہ بیزار
اور میں جیسے کوئی آہ اثر سے پہلے

یہ عشق حُسن نہیں جو ادا کا ہو محتاج
کہ بے حجاب و وسیلہ ادا ہُوا کہ نہیں

میں بولتی کتاب ہوں لوگوں کے درمیاں
سنگِ حَرم کہ خِشتِ کلیسا نہیں ہُوں میں

دیکھو تو سنگِ رہ کی طرح ہُوں پڑا ہُوا
سوچو تو کیا وجود خدا کا نہیں ہُوں میں

اپنے سائے خود پلنا تم میرے رستے مت چلنا تم
مجھ تک ہی ہیں میرے ڈھنگ میں ہوں بے کشکول ملنگ

دیکھی جو خود کی آئنۂ ہست میں جھلک
مجھ کو یہی لگا کہیں دیکھا ہُوا تھا مَیں

نایاب ہے یہ گردشِ سیّارگاں کی راکھ
کچھ سر پہ ڈال کچھ کف و دامن میں لے کے چل

چیں چیں پیں پیں کرتے رہ گئے
مرنے والے مرتے رہ گئے

مَیں مَیں مَیں مَیں کرنے والے
مَیں مَیں مَیں مَیں کرتے رہ گئے

مارے خودی کے مارے خدا کے
وہم کی تہہ میں اُترتے رہ گئے

اندھے تھے، اُن دیکھے خدا سے
اپنے خلا کو بھرتے رہ گئے

جی گئے موت پہ مرنے والے
ڈرنے والے ڈرتے رہ گئے

کاش یوسفؑ کی حقیقت ہی نہ کھلتی ہم پر
اب تو ہر وہم زلیخا نظر آنے لگا ہے

کیا تمنا پہ کُھلا اگلے قدم کا امکاں
کسی جانب قدم اٹھتا نظر آنے لگا ہے

خاکسترِ ستارہ ہے آئندۂ نمو
بہتر یہی ہے مَیں کسی جانب رواں رہوں

آپ ہی تو ہیں روحِ حقیت اگر آپ ہیں
آئینے کے اُدھر کچھ نہیں ہے اِدھر آپ ہیں

بے خبر ہیں تو اپنی خبر سے گزر جایئے
جب تلک آرہی ہے خبر بے خبر آپ ہیں

ذات کے اسم سے ذات کا ذات ہونا ہے کیا
ننگ ہی ہیں اگر آپ کے نام پر آپ ہیں

ہم نے کفن بھی دیکھ لیا اوڑھ کر مگر
وہ ننگ تھے کہ ہم سے چھپاہی نہیں گیا

اے عقل جس کی تہہ سے نہ اُبھرے کوئی سوال
ایسا کوئی، جواب دیا ہی نہیں گیا

آ گئے آپ، آیئے صاحب
کیا خبر ہے، سُنایئے صاحب

کیجے اک اور دعوتِ مرہم
زخم اک اور کھایئے صاحب

گھورتے کیا ہیں آپ اندھیرے کو
اک دیا تو جلایئے صاحب

سوچتے کیا ہیں گردشِ افلاک
آپ چرخہ چلایئے صاحب

زندگی ''کیا'' ہے زندگی ''کیوں'' ہے
سوچ کر مَر نہ جایئے صاحب

رہیے خاموش گر نہیں ہے دلیل
شور تو مت مچایئے صاحب

بھوک ہے مفلسی ہے کیجئے عیش
کھایئے اور کمایئے صاحب

اب اِس کو دید کہیں یا اِسے کہیں دیدار
ہمارے آگے سے جو ہم ہٹا دیے گئے ہیں

کچھ اِس طرح سے کہا مجھ سے بیٹھنے کیلئے
کہ جیسے بزم سے اُس نے اٹھا دیا ہے مجھے

مری سمائی نہ صحرا میں ہے نہ گھر میں ہے
نیا یہ مژدۂ وحشت سُنا دیا ہے مجھے

لے جاتے ہیں اُڑا کے حریفانِ جام و مے
ہم جو پیالہ بھرتے ہیں خوں کی کشید سے

پیتے ہیں چُھپ کے آ کے بہکتے ہیں بزم میں
کھلتے ہیں یعنی اور بھی کارِ مزید سے

ہر گُل بدن کو تکنا آنکھوں سے چوم رکھنا
دیوانگی ہماری حد سے گزر گئی ہے

صیاد کی مِنّت نہ کوئی دام کی حسرت
آزاد اڑا اتنا کہ پر ہار گیا دل

سنوارنے میں کوئی مر رہا ہے زُلف اپنی
کسی کو زُلف بکھرنے کا بھی خیال نہیں

وہم آیا ہے حقیقت کو برہنہ کرنے
یا اُسے اور چھپانے کیلئے آیا ہے

اٹھ گیا خود وہ مگر اس سے اٹھائے نہ اٹھا
جو بھی یاں پردہ اٹھانے کیلئے آیا ہے

کوئی آیا ہے بنانے کیلئے بات کی بات
اور کوئی بات گُھمانے کے لیے آیا ہے

دُکھتا ہے دکھائی نہیں دیتا ہے مِرا زخم
نادیدہ خدا کی طرح گہرا ہے مِرا زخم

اے بخیہ گرو، چارہ گرو، راہ لو اپنی
کب بخیہ و مرہم میں سماتا ہے مِرا زخم

ہو شام تو رندوں کے لیے ہے یہ پیالہ
ہو صُبح تو درویشوں کا کاسہ ہے مِرا زخم

نہ کیوں ماتم کروں، کیوں سر نہ پیٹوں، کیوں نہ خوں اُگلوں
نہ کیوں روؤں کہ جب ہنس کر اُڑایا جا رہا ہُوں مَیں

تماشا بن گیا ہُوں آ کے یارب تیری محفل میں
اُٹھایا جا رہا ہُوں مَیں بٹھایا جا رہا ہُوں مَیں

لگا کر زخم، اذیّت دے کے، غم میں مبتلا کر کے
بڑی بے رحمی سے بے حِس بنایا جا رہا ہُوں مَیں

سُخن ہو کوئی، کوئی گفتگو ہو، بحث ہو کوئی
مجھے لگتا ہے مُجھ ہی کو سنایا جا رہا ہُوں مَیں

ہم ہیں آگاہِ مذہب و الحاد
ہم ''نہیں'' میں نہ ''ہاں'' میں رہتے ہیں

ڈھونڈتا کیا ہے عرش پر ہم کو
ہم اِسی خاکداں میں رہتے ہیں

آپ کی بات کون سمجھے گا
آپ بھی کس گُماں میں رہتے ہیں

دن کے ہنگامے کے بعد اِس طرح سے آئی ہے شام
جیسے چُپ ہو جائے کوئی گفتگو کرتے ہوئے

جینے مرنے سے آیئے باہر
آگہی کا ہے مدّعا کچھ اور

کر نہ حسرت خلا کو بھر نے کی
ورنہ بڑھ جائے گا خلا کچھ اور

صدقے مَیں تیری خوش کلامی کے
اور کچھ اور اے خُدا کچھ اور

تیری بانہوں میں آکے سیکھ گئے
ہم کو آتا نہیں تھا مَر جانا

مَوت سے پہلے مَر گیا ہُوں مَیں
لاش سے پہلے مجھ کو دفنانا

اس لیے کر رہا ہُوں خود کو تلاش
ڈھونڈ کر ہے مُجھے خُدا لانا

پڑ گئی کم یہ کائنات نوؔید
ایک نقطہ تھا مجھ کو پھیلانا

کام آئیں گے گئے وقتوں کے مُلّا نہ حکیم
ہے نیا مرض نئی اِس کو دوا چاہیے ہے

سب یہ سمجھے میں خدا ڈھونڈنے نکلا ہُوا ہُوں
درحقیقت مجھے خود اپنا پتا چاہیے ہے

بات کے بدلے میں ہے بات ہی درکار مجھے
چاہیے ہے نہ ستائش نہ صلہ چاہیے ہے

سب نے رَد کر دیا تو پھر مَیں نے
اپنے ہونے کا اعتبار کیا

چاند کا سَر تھا میرے زانو پر
اِن ستاروں کو جب شمار کیا

''کیوں'' سے اور ''کیا'' سے مِرا دھیان ہٹانے کے لیے
درد و مرہم سے مِرا زخم بھرا جاتا رہا

مُجھ سے اک بے خیال نے یہ کہا
آپ اپنا خیال رکھیے گا

کیا اِسی لمحے مِرا عالمِ ''ھُو'' سے ہے گُزر
ایک لمحہ جو سبک ہے نہ گراں ہے کیا ہے

ہے تو کیفیتِ انزال کی سرمستی ہے
مجھ پہ طاری نہ زماں ہے نہ مکاں ہے کیا ہے

تم نے تو کیا نہ کیا تم تو خدا بن بیٹھے
ہم سے تو کچھ نہ ہوا وقت گنوانے کے سوا

اُس کی مرضی ہے وہ شکوہ کرے یا شکر کرے
ہر بشر ''مَیں'' کے کھلونے سے ہے بہلایا ہُوا

مَر نہیں جاتا میں کیسے روشنی کرتا کشید
میرے اندر کی یہ تاریکی نہ گر ڈستی مُجھے

اُتنا ہی مجھے دیکھنا جتنا مَیں نظر آؤں
بھُولے سے بھی یہ پردہ اُٹھانا نہ گرانا

تُم میری حقیقت سے ہی واقف نہیں صاحب
ممکن ہی نہیں مجھ کو بڑھانا نہ گھٹانا

کہاں یہ وہم، کہاں وہ حقیقتِ واجب
مگر محال کو ممکن بنانا پڑتا ہے

کہاں مثال، کہاں وہ، مگر برائے وجود
کسی مثال کو تو لے کے آنا پڑتا ہے

رات اُس بزم میں تصویر کے مانند تھے ہم
ہم سے پوچھے تو کوئی شمع کا جلنا کیا تھا

نہ میں تلاش کروں خود کو پیشِ آئینہ
نہ یہ سوال اُٹھاؤں کہ آئینہ کیا ہے

یہ تُو نے کس طرح جانا کہ میں خُدا نہیں ہوں
تجھے خبر ہے خدا کون ہے خدا کیا ہے

خود سے گزرے نہیں تم اور نہ خدا تک پہنچے
اک خلا سے چلے اور ایک خلا تک پہنچے

درمیاں میں ہی تمہیں کھا گئی تفصیلِ عدد
صفر سے تم نہ چلے اور نہ ''لا'' تک پہنچے

کس طرح تم پہ کُھلے اوّل و آخر کا فسوں
خامشی سے نہیں گزرے نہ صدا تک پہنچے

تم نے کیا ڈھونڈا ، تمہیں کیا مِلا ، یہ تم جانو
ہم بقا ڈھونڈ رہے تھے سو فنا تک پہنچے

درد کی چھوڑ و کہ وہ وہم بھی ہو سکتا ہے
یہ بتاؤ مجھے تم ، کیسے دوا تک پہنچے

کہا کس نے سُکون چاہیے ہے
کام کو اک جنون چاہیے ہے

کہا مَیں نے کہ چاہیے ہے کیا
کہا اُس نے کہ خون چاہیے ہے

بے ثباتی ، ثبات ہے درکار
بے فسونی ، فسون چاہیے ہے

اے حقیقت بُرون اپنی جگہ
وہم کو تو دُرون چاہیے ہے

''ہے'' کے خلا میں گُم ابدیّت کو خیر باد
اے ذات کے ''نہیں'' تری غَیبت کو خیرباد

اے ساکنانِ دیر و حرم سب کو الوداع
مذہب، دھرم، گماں، دہریّت کو خیرباد

اپنے نشے میں ڈوبی طریقت کو الوداع
خود کو فریب دیتی شریعت کو خیرباد

بس اک خیالِ ''ھُو'' نے مجھے کر دیا ہے مست
شکّ و یقین و وہم و حقیقت کو خیرباد

میں نے بسا لیا ہے الگ اک جہانِ ''ھُو''
یعنی جہانِ کثرت و وحدت کو خیرباد

کیا اپنے کُل کو جزوِ تماشا کریں گے آپ
یا دُور ہی سے ہونے کو دیکھا کریں گے آپ

ہونے سے اپنی جان چھڑائیں گے کس طرح
کیا خود سے جینے مرنے کا جھگڑا کریں گے آپ

جب آپ جانتے ہی نہیں آپ کون ہیں
کس منہ سے اُس نظر کا تقاضا کریں گے آپ

خود سے گزر کے آگئے اب یہ بتایئے
کیا چپ رہیں گے یا کوئی دعویٰ کریں گے آپ

تم یہ کہتے ہو بس امکان ہے ہونے کی دلیل
ہم محالِ محض امکان کہاں سے لائیں

ہمیں معلوم ہے آرائشِ جلوہ تکلّف ہے
یہ زیبائی ہے پردہ، حسن زیبائی سے آگے ہے

ہے یوسف کی حقیقت خوابِ یوسف سے گزر جانا
زلیخا کی تمنا تو زلیخائی سے آگے ہے

ترا ہنسنا ہے اک نغمہ ترا رونا ہے اک نوحہ
مگر وہ نغمہ و نوحہ جو شہنائی سے آگے ہے

یہ بات کوئی شکم سیر کس طرح سمجھے
کہ مَیں نے رزق کی صورت خُدا تلاش کیا

ادا اُسی نے کیا حقِّ زندگی یعنی
وہ جس نے اپنا کوئی مسئلہ تلاش کیا

کود پڑتے ہیں سرِ آتشِ ہنگامِ سوال
ہم نہ ''کیا'' دیکھتے ہیں اور نہ ''کیوں'' دیکھتے ہیں

درد کا حد سے گزر جانا ہے اور کچھ بھی نہیں
میرے چہرے پہ جو یہ آپ سکوں دیکھتے ہیں

بے دلی کا تو ہے احوال بیاں سے باہر
ایک مدّت سے ترسنے کو بھی ترسا ہوا ہوں

اک حقیقت کی طرح دیکھ رہا ہوں خود کو
اپنے ہی خواب میں اِس وقت میں آیا ہوا ہوں

الٰہی تو متکبّر ہے یہ سوال نہیں
سوال یہ ہے مجھے تو نے عاجزی کیوں دی

جہاں ہیں دیر و حرم بائیں دائیں سنگ بہ دست
مجھے گزرنے کو یارب وہی گلی کیوں دی

الٰہی جاہلیت سے بھرے زمانے میں
کُھلا نہ مجھ پہ مجھے تُو نے شاعری کیوں دی

نہ وہم تھا نہ حقیقت، گُمان تھا نہ یقیں
وہ جس کو مَیں ترا بندِ قبا سمجھ رہا تھا

کُھلا یہ مجھ پہ کُھلی مجھ پہ جب حقیقتِ ''ھُو''
وہ وہم تھا کہ جسے میں خدا سمجھ رہا تھا

کون جانے کہ میری خلوت میں
وہ برہنہ ہُوا ہے میرے لیے

مُجھ سے مِل کر ہی کیجئے گا طَے
آپ نے جو سُنا ہے میرے لیے

تجھے یہ غم ہے ترا مدّعا نہ بَر آیا
مُجھے تو دیکھ کہ مَیں مدّعا بھی بھول گیا

بیٹھ جائے جو مِری صحبت میں
اُس کو درویش بنا سکتا ہُوں

یہی کر سکتا ہُوں مَیں کاسہ بدست
اک صدا اور لگا سکتا ہُوں

آپ کوئی دلیل تو دیجے
شور تو مَیں بھی مچاسکتا ہُوں

زرد چہرہ کہاں لے جاؤں مگر
درد تو سب سے چھپا سکتا ہوں

زور پر اپنی بندگی کے نوؔید
اک خُدا مَیں بھی بنا سکتا ہُوں

زمیں پر اپنا کوئی کام دیکھو
ستارے کب تلک آخر گنو گے

نہیں ہے بس میں، ہے بس میں تمہارے؟
تصّور میں حقیقت ڈھونڈ لوگے؟

حقیقت سے جو تم کترا رہے ہو
تم اپنا سامنا کیسے کروگے

اک ایسی بات پر مَیں رو رہا ہوں
جسے سُن کر تُم اہلِ دل ہنسو گے

مِلو گے میر صاحب سے ہی پھر تُم
اگر تُم میر صاحب سے مِلو گے

بوالہوس کرہی گئی حُسن پرستی تجھ کو
دلِ وحشی تجھے کتنا کوئی سمجھائے گا

غیب کی بات نہ کر دیدۂ دل کے آگے
دل تو مانے گا اُسی کو جو نظر آئے گا

ایک دُنیا تو رہے مشغول اپنے کام میں
اور مَیں خلوت میں تنہا بیٹھ کر ''کیا'' ''کیوں'' کروں

سامنے ہیں آپ میرے کیوں نہ چاہوں آپ کو
جس کو دیکھا ہی نہیں اُس کی تمنا کیوں کروں

اس کچھ نہیں نے کیا کہیں کیا کچھ نہیں دیا
ویسے جو دیکھیے تو محبت میں کچھ نہیں

اس جستجوئے خواب کا حاصل کچھ اور ہے
منزل میں کچھ نہیں ہے مسافت میں کچھ نہیں

گزرے بغیر کیسے کھلے گا یہ عشق پر
کچھ بھی نہیں ہے وصل کی حسرت میں کچھ نہیں

ترے وجود میں جب ''تُو'' مچل گیا ہوگا
خدایا کُن ترے منہ سے نکل گیا ہوگا

ادھر اُدھر ہیں سبھی غیب کے تمنائی
اِدھر اُدھر ترا جادو تو چل گیا ہوگا

خدایا کس طرح مَیں خود کو بے خیال کروں
اگرچہ وہمِ حقیقت سے میں نکل آیا

اِس سے سنا ہے، اُس نے کہا ہے ، یہ مت بتا
سمجھا مجھے خدا کو خدا مانتا ہے کیوں

جا کر سرِ فلک لڑیں یزداں و اہرمن
آخر مری زمین پہ جھگڑا مچا ہے کیوں

تو نے کبھی سوال کیا اپنے آپ سے
جینا مِلا ہے کیوں تجھے مرنا مِلا ہے کیوں

سب جا رہے ہیں دیر و حرم زور و شور سے
تو رہگزر میں اس طرح بے حِس پڑا ہے کیوں

ہے اگر توفیق کر دے گی تمہیں سیراب پیاس
گر نہیں توفیق تو پیاسے لبِ کوثر رہو

آ گیا ہوں گُزر کے مَوت سے میں
زندگی پھر شروع کردی ہے

راستی پر میں آ گیا ہوں پھر
گمرہی پھر شروع کردی ہے

اٹھ گیا ہے الوہیت سے دل
بُت گری پھر شروع کر دی ہے

توبہ سے کر کے میں نے پھر توبہ
مے کشی پھر شروع کردی ہے

ہر اک سے مجھ کو شکایت کہ سوچتے نہیں کیوں
ہر اک کو مجھ سے شکایت کہ سوچتا کیوں ہے

اگر نہیں ترے پاس اپنے مسئلے کا حل
ہر اک کا مسئلہ ہر اک سے پُوچھتا کیوں ہے

اگر سبھی یہاں لایعنی ہے عبث ہے تو پھر
یہ سوچتا ہوں مجھے سوچنا مِلا کیوں ہے

اگر نہیں مری آواز وقت کی آواز
زمانہ پھر مرے لہجے میں بولتا کیوں ہے

اک پردۂ حجاب سے لپٹے ہوئے ہیں سب
تابِ برہنگی تجھے عریاں کرے گا کون

''ہے'' ''ہے'' کی رٹ لگائے ہوئے ہیں سبھی یہاں
آئی صدا نہیں کی تو پھر ہاں کرے گا کون

درونِ قلب کسک ڈالنے کو آیا ہوں
ترے یقین میں شک ڈالنے کو آیا ہوں

جہانِ کہنہ کا آتش کدہ پڑا ہے سرد
میں نارِ نَو کی دہک ڈالنے کو آیا ہوں

پڑا ہے بے حس و حرکت ازل سے طفلکِ عقل
جسد میں اُس کے ہمک ڈالنے کو آیا ہوں

مَیں لکھ کے اِک نیا نغمہ برائے طائرِ نَو
فسردہ دل میں چہک ڈالنے کو آیا ہوں

بحر ہرگز نہیں ہوتا پئے سیرِ ساحل
بے خطر تہہ میں اُترنے کے لیے ہوتا ہے

تھام ہاتھوں میں لجامِ فَرسِ ماہ و نجوم
ہاتھ کیا ہاتھ پہ دھرنے کے لیے ہوتا ہے

راستے کو کیا اِس واسطے منزل میں نے
یہ جہاں بھی ہو گزرنے کے لیے ہوتا ہے

کارِدل، کارِجہاں، کارِجنوں، کارِخرد
کام کوئی بھی ہو کرنے کے لیے ہوتا ہے

اٹھو کہ خوف سے سجدے میں کیوں پڑے ہوئے ہو
یہ کہہ رہا ہے اندھیرا دیا تلاش کرو

یہ کیا کہ پایا ہوا پاؤ اِس خرابے میں
کرو تلاش تو ڈھونڈا ہوا تلاش کرو

ہر ایک چیخ رہا ہے مری سنو پہلے
بلا کے شور میں کس کی صدا تلاش کرو

نوؔید تُم بھی کوئی فلسفی ہو ماضی کے
کہ حل نہ دو کوئی بس مسئلہ تلاش کرو

تُو بھی کیا ہے خدائی سے بیزار
اے خدا بندگی سے تنگ ہوں میں

تجھ میں ہوگی زیادتی تیری
مجھ میں اپنی کمی سے تنگ ہوں میں

کوئی آئے تو کیسے آئے قریب
اپنی ہی شعلگی سے تنگ ہوں میں

مَوت سے دور زندگی سے دور
مستقل جانکنی سے تنگ ہوں میں

اے خدا کوئی گوشۂ گمنام
سب کی دانشوری سے تنگ ہوں میں

تھکن کو جان کے منزل جہاں ٹھہر گئے تم
یہ جان لو میں وہاں سے گزر کے آ رہا ہوں

جُوں طفلکِ نادان ہُمکنے تو لگے ہیں
شعلے کی طرف ہم بھی لپکنے تو لگے ہیں

باتوں کے تئیں ربط بھی آ جائے گا اک دن
کچھ کچھ یونہی بے ربط سا بکنے تو لگے ہیں

کچھ تو نظر آنے کو ہے اے وہمِ حقیقت
پردے جو تھے آنکھوں پہ سرکنے تو لگے ہیں

کُھل جائے گی پوشیدہ حقیقت بھی کسی روز
ہر منظرِ مبہم پہ ٹھٹکنے تو لگے ہیں

نشّہ ابھی تازہ ہے ذرا وقت گزرجائے
ہو جائیں گے یکسو بھی بہکنے تو لگے ہیں

معلوم سے معلوم تلک کیجے سفر آپ
ہم اپنی جگہ خوش ہیں بھٹکنے تو لگے ہیں

تاویلِ خود آگاہی کو یہ بات ہے کافی
ہم اپنی نگاہوں میں کھٹکنے تو لگے ہیں

یہ کہہ رہے ہیں مگر تجھ سے تیرے غیب و حضور
نہ ہے حجاب کوئی اور نہ بے حجابی ہے

یہ تیری چشم کا کُھلنا ہے بند ہونا ہے
نہ ہے نقاب کوئی اور نہ بے نقابی ہے

صُبح سے کچھ غرض نہ شام سے کام
میں تو رکھتا ہوں اپنے کام سے کام

مجھ کو کیا تو خدا ہے یا بندہ
مجھ کو تو ہے دعا سلام سے کام

یا مَرے کوئی یا جیئے کوئی
اُن کو ہے صرف رام رام سے کام

نہ دے گا وجہِ تماشا مجھے تماشا گر
وہ بس ہنسائے گا مجھ کو وہ بس رُلائے گا

تراش لے گا نیا اک خدائے نامعلوم
بشر کو خوفِ نہ معلوم جب ستائے گا

پسِ مہرِ صبح دیکھو، پسِ ماہِ شام دیکھو
کہ گزر کے روز و شب سے، ذرا یہ نظام دیکھو

ہے خدا کہ تیغ کیا ہے، کہ وہ بے دریغ کیا ہے
ہے جو دیکھنا تو اُس کو، کبھی بے نیام دیکھو

کہیں شبہہ ہے بتوں کا، کہیں وہم ہے خدا کا
یہ خرد کے رنگ دیکھو، یہ جنوں کے کام دیکھو

ہے جو ڈر شکستگی کا، ہے جو خوف نارسی کا
تو یہ عشق وشق چھوڑو، کوئی اور کام دیکھو

کُو بہ کُو یعنی سراسیمہ پھرایا گیا ہُوں
ہرجگہ بیٹھنے سے پہلے اُٹھایا گیا ہُوں

میں کوئی عقل ہُوں جو میرا بنایا ہے مذاق
میں کوئی دل ہُوں جو اِس طرح دُکھایا گیا ہُوں

مجھ کو اِس واسطے ہے شام وسحر اپنی تلاش
اک خدا کی طرح میں خود میں چُھپایا گیا ہُوں

تا نہ سوچوں کہ یہ دُنیا کا تماشا کیا ہے
مَیں رُلایا گیا ہُوں اور مَیں ہنسایا گیا ہُوں

اے خُدا کیا ہے یہ جنت سے زمیں تک کا سفر
مَیں اُجاڑا گیا ہُوں یا کہ بسایا گیا ہوں

مَوت نے کردیا ہے ایک سوال
زندگی لاجواب ہو گئی ہے

اِس قدر تیز روشنی، توبہ
بے حجابی حجاب ہو گئی ہے

جو خرافات تھی زمانے کی
شاملِ ہر نصاب ہو گئی ہے

یعنی میں زندگی نہ کروں زندگی کے بیچ
اِس زندگی میں کیا ہے چھپا ڈھونڈتا رہوں

کیا ''کیوں'' کا ''کیوں'' تلاش کروں ساری زندگی
کیا ساری عُمر ''کیا'' میں ہے ''کیا'' ڈھونڈتا رہوں

یہ درد کیوں دیا ہے مجھے تو نے اے خدا
کیا اِس لیے دیا ہے دوا ڈھونڈتا رہوں

کُھلتا نہیں یہ راز کہ کیوں دی گئی ہے عقل
یعنی ''نہیں'' میں ''ہے'' کا پتا ڈھونڈتا رہوں

مُجھے پہنچانا ہے سب کو سوالوں سے سوالوں تک
جوابوں سے میں کم عقلوں کو بہلانے نہیں آیا

تمہیں بس زندگی کے باب میں سنجیدہ کرنا ہے
میں گنجلک زندگی کو اور اُلجھانے نہیں آیا

برائے منزلِ گُم گشتہ بھٹکانے کو آیا ہوں
کسی کو بھی میں راہِ راست پر لانے نہیں آیا

یہاں لایا ہے مجھ کو کھینچ کر اسرارِ مے خانہ
فقط پینے پلانے کو میں مَے خانے نہیں آیا

مجھے نقطے کو نقطہ ہی بیاں کرنا ہے مِنّ و عن
کسی بھی شکل میں نقطے کو پھیلانے نہیں آیا

علم نقطہ تھا جسے سمجھا نہ سمجھایا گیا
خامۂ جہل سے بس نقطے کو پھیلایا گیا

اتنا پھیلایا کہ جب ہو گیا نقطہ معدوم
فکر و دانش کا کرشمہ اُسے ٹھہرایا گیا

کی گئیں نوعِ بشر پر سبھی راہیں مسدود
ایک رستے پہ لگا کر اُسے بہکایا گیا

تاکہ خود اُس کی ہی تنہائی نہ کھا جائے اُسے
عقل اور عشق سے انسان کو بہلایا گیا

کس سے دریافت کروں بوالہوسی خود ہے سوال
کس لیے پیرہن عُریانی کو پہنایا گیا

تجھ پہ کُھل جائے گی بس حیرتِ لاعلمیِ عِلم
اِس سے آگے تو تجھے عقل پڑھا سکتی نہیں

میں نہیں سمجھا تجھے کیوں ہے حقیقت کی طلب
وہم سے آگے تری عقل تو جا سکتی نہیں

مجھ کو چپ لگ گئی جب سے یہ کُھلا ہے مجھ پر
بات تو وہ ہے کہ جو بات میں آ سکتی نہیں

یہاں سکتا ہے بلاغت کو فصاحت عاجز
ہے زباں گنگ کہ خاموشی سُنا سکتی نہیں

یقیناً ہنسے رونے میں ہیں آگاہی بھی غفلت بھی
کہ کچھ دیکھو نہ دیکھو جینا مرنا دیکھنا ہوگا

آخرش بن گیا میں خود ہی سوال
جب میں تیرا جواب لا نہ سکا

آخرش میری چشمِ مِنت سے
خود کو تو بھی کہیں چُھپا نہ سکا

آخرش تیرا جلوۂ بیباک
میری نظروں کی تاب لا نہ سکا

وہ کون ہے کہ جو ''ہے'' بھی نہیں جو ''تھا'' بھی نہیں
کہ جو ہُوا بھی نہیں اور جو بنا بھی نہیں

اُسی کے دَم سے ہُوا تیرا بت کدہ آباد
وہ ایک بُت جو تیرے بُت کدے میں تھا بھی نہیں

ابھی سے کیوں تِرا دل آ گیا ہے آنکھوں میں
ابھی تو میری خموشی نے کچھ کہا بھی نہیں

عجب سفر تھا ''نہیں'' سے ''نہیں'' تلک میرا
کہ میں چلا بھی نہیں اور میں رُکا بھی نہیں

خیال و مستی و ہوش و جنون و عشق و خرد
اگر نہ ہوتے یہ گاہک تو کھلتی کیسے دُکان

جو مَیں نے ڈھونڈا تو انساں میں آ گیا وہ نظر
جو فلسفی تھے وہ کہتے رہے اُسے امکان

جان لوگے جب کبھی اٹکے گا کانٹا حلق میں
پُوچھتے کیا ہو کہ کیسے زندگی کرتا ہوں میں

کون ہے تُم میں ولی پہنچے جو اِس پرواز کو
کافری کرتا ہوں میں یا بندگی کرتا ہوُں میں

یعنی جو بھی ہے شہود اُس کو میں کرتا ہوں وجود
جبکہ دُنیا کی نظر میں بُت گری کرتا ہوں میں

پردۂ ہستی اٹھا کر کھولتا ہوں رازِ غیب
جبکہ کہتی ہے یہ دُنیا شاعری کرتا ہوں میں

تم خدا کے واسطے گر لا سکو خود اپنی تاب
درمیاں میں ہے جو پردہ وہ اٹھا سکتا ہوں میں

کر رہا ہے جو مسافر خود سے خود تک کا سفر
اک دیا تو راہ میں اُس کی جلا سکتا ہوں میں

بات جو دل میں آئی تھی کر دی
آپ سمجھے کہ شاعری کردی

کہہ کے وہ بھی مُکر گیا آخر
سُن کے ہم نے بھی اَن سُنی کردی

رات اک گفتگو کی محفل میں
رہ کے چپ ہم نے خامشی کردی

اور تو خیر کیا ہُوا ہم سے
ہاں مگر ہم نے زندگی کر دی

اُس نے نزدیک سے دِکھا کے جھلک
دُور تک دل میں روشنی کردی

اُس نے کوئی سِرا دیا نہ مجھے
بات کرنے کو بات بھی کردی

عقل سے پہلے مگر دل ہے تمہیں کیا معلوم
ایک مُشکل پَسِ مُشکل ہے تمہیں کیا معلوم

ایک جلوہ پَسِ ہر جلوہ ہے جلوہ آرا
ایک محمل پَسِ محمل ہے تمہیں کیا معلوم

ایک خنجر ہے حقیقت میں پَسِ ہر خنجر
ایک بسمل پَسِ بسمل ہے تمہیں کیا معلوم

موج دَر موج ہے دریا پَسِ دریا یعنی
ایک ساحل پَسِ ساحل ہے تمہیں کیا معلوم

بس یہی ایک تسلسل ہے سفر بعدِ سفر
ایک منزل پَسِ منزل ہے تمہیں کیا معلوم

ایک تنہائی ہے تنہائی پَسِ تنہائی
ایک محفل پَسِ محفل ہے تمہیں کیا معلوم

جب تک نہ خود کو دیکھے گا غافل رہے گا تُو
کعبے کو دیکھ لے کہ کلیسا کو دیکھ لے

آئے تو کیسے اُس کو خدا پر یقین آئے
جب تک نہ قیس صورتِ لیلیٰ کو دیکھ لے

مُشکل یہ ہے کہ درد تو آتا نہیں نظر
تُو اپنے زخم میں ہی مسیحا کو دیکھ لے

اے حقیقت مِرے آگے تھا زمانے کا شعور
بے نشانی کو جو میں اپنا علَم لکھتا رہا

اُس کے کُھولے سے کُھلے گا نہ مِرا اگلا قدم
دشتِ امکاں کو جو بس ایک قدم لکھتا رہا

ماء و تُو سے گُزر آؤ تو کُھلے وہ تم پر
''مَیں'' میں ''تُو'' کرکے بہم خود کو جو ''ہم'' لکھتا رہا

وہ کون رشتہ تھا آقا غلام سے پہلے
وہ کون، کون تھا معنی و نام سے پہلے

بنا یا نشّے نے ساقی کو ساقی رند کو رند
یہ تفرقہ نہ تھا مینا و جام سے پہلے

کسی بھی مست کو آبِ بقا کی فکر نہ تھی
مزے سے جیتے تھے خوابِ دوام سے پہلے

کوئی نظام تو فطرت میں ہوگا پوشیدہ
ترے دیے ہوئے فاضل نظام سے پہلے

یہی کلام کی موجد ہے اوّل و آخر
جو نطق میں ہے خموشی کلام سے پہلے

جو آتے آتے یہاں تک بدل گئی آخر
وہ بات کیا تھی جو تھی خاص و عام سے پہلے

تم جاؤ اپنا کام کرو
دُنیا میں اُونچا نام کرو

گر نام کمانا ہے تم کو
جاؤ مجھ کو بدنام کرو

ہر لوحِ قلب ہے آمادہ
تم اپنا شعر الہام کرو

جب دل نہ لگے معمورے میں
کیا صبح کرو کیا شام کرو

ہے ایک بے خبری جو خبر کے بعد کی ہے
ہے ایک بے خبری جو خبر سے پہلے ہے

دکھائے اوّل و آخر تو تم نے کھینچ کے خط
یہ دائرہ تو بتاؤ کدھر سے پہلے ہے

اے خُدا مَیں بھی کون قطرہ ہُوں
میرا دریا میں دل نہیں لگتا

بس اُسی سے میں دل لگاؤں گا
جس کا دنیا میں دل نہیں لگتا

جہاں نہیں ہے کسی کو بھی روشنی کی طلب
وہاں چراغ جلانے کی کیا ضرورت ہے

بہانے ڈھونڈتا گر تجھ کو ماننا ہوتا
نہ ماننے کو بہانے کی کیا ضرورت ہے

ہے کس لیے اُسے منوانے پر مُصر واعظ
خدا کا ہونا بھی کیا بندگی کی حد تک ہے

خود سے مَیں بچھڑا تو نہیں ہوں
لیکن مُجھ کو مُجھ سے مِلا دے

دھنسادے مجھ کو میرے اندر
مُجھ کو بھی پرواز کرا دے

سُن لیا میں نے شورِ من و تُو
اب مجھ کو خاموشی سُنا دے

آگ کو کر پانی سے ٹھنڈا
اور پانی میں آگ لگا دے

سارا اُلٹا کردے سیدھا
اور سارا سیدھا اُلٹا دے

مجھ کو نہیں کچھ بھی سمجھانا
تُو جو سمجھا ہے سمجھا دے

دکھائی ہے جو حقیقت نے خواب کی صورت
اب اِس کو وہم نہ کہیے تو اور کیا کہیے

مِرے گماں میں حقیقت کو کہیے خوابِ کہف
میرے یقین میں تعبیر کو بُدھا کہیے

کوئی سوال، کوئی تبصرہ، کوئی پہلو
کہا یہ کس نے کہ ہر بات پر بجا کہیے

اگر نہیں ہے کوئی اپنی بات آپ کے پاس
تو پھر لکھا ہُوا لکھیے کہا ہُوا کہیے

اب کسی شخص سے کچھ بھی نہیں کہنا مجھ کو
ایسے رہنا ہے کہ جیسے نہیں رہنا مجھ کو

میں جو عُریاں تھا سو عُریاں ہی ہُوا ہُوں ظاہر
تو کسی طرح کا ملبوس نہ پہنا مجھ کو

نہ کوئی رنگ ہے میرا نہ کوئی ہیّت ہے
راس ہے آبِ رواں کی طرح بہنا مجھ کو

بوالہوس تو نہیں رہ جاؤں جو میں تشنۂ دید
حسن پردے میں بھی رہ کر ہے برہنہ مجھ کو

کوئی اٹھائے مجھے اور کوئی بٹھائے مجھے
خدایا زندگی کرنا کوئی سکھائے مجھے

وہ کیا ہے جو نہ الف میں ہے اور نہ ایک میں ہے
ورائے حرف و عدد بھی کوئی پڑھائے مجھے

مجھے خدا سے ملانے کو آ گئی خلقت
کہا تھا میں نے کہ مجھ سے کوئی ملائے مجھے

یہاں تو سب ہی رہِ مستقیم پر ہیں رواں
ہے کوئی بھٹکا ہوا راستا دکھائے مجھے

کیا ہے میں نے کب انکار بندہ بننے سے
مگر ہے شرط کہ بگڑا ہوا بنائے مجھے

کُھلا کہ خلد سے آدم کو کیوں نکالا گیا
اشارہ جب مجھے آوارگی کا گھر سے ملا

اگر ہوتا نہ یہ انسان مارا خوف و لالچ کا
نہ ہوتا اہرمن کوئی ، کوئی یزداں نہیں ہوتا

چُھڑا لے گا یہ انساں جان اَن دیکھے خدا سے بھی
کوئی بھی کام مشکل کے بنا آساں نہیں ہوتا

ہر اک لمحہ بدلتا رنگِ دنیا دیکھتے رہیے
لبوں سے کچھ نہ کہیے بس تماشا دیکھتے رہیے

نظر ہٹنے نہ پائے لمحہ بھر کو بھی تغیر سے
ہر اک لمحہ گزرنے کا گزرنا دیکھتے رہیے

عجب سا ایک خلا ہے تمہاری آنکھوں میں
یہ کچھ بتا رہے ہو یا یہ کچھ چُھپا رہے ہو

تمہارے پاس خدا کے سوا نہیں کوئی بات
وہی سنی ہوئی ہر پھر کے کیا سنا رہے ہو

نہ خود کھڑے ہوئے ہو اپنی بات کے پیچھے
نہ اپنی بات کے پیچھے دلیل لا رہے ہو

یہ تنگ آ گئے خود سے کہ پالیا خود کو
جو اپنے سامنے سے آئنہ ہٹا رہے ہو

جو کہہ رہا ہوں میں انسان ہے خدا کا وجود
ہے اِس گناہ کا کتنا بڑا ثواب نہ پوچھ

بسا کے اُس کو تصّور میں جیسا جو دیکھے
یہ بے حجابیِ صورت گرِحجاب نہ پوچھ

سوال کرتو دیا میں نے اُن سے کون ہیں آپ
جو اُس کے بعد ہوا حالِ آں جناب نہ پوچھ

ورنہ میں بھی کوئی خدا ہوتا
بندگی نے بچا لیا مجھ کو

ورنہ مجھ کو بھی مار دیتا غیب
بُت گری نے بچا لیا مجھ کو

ورنہ آجاتا راہِ راست پہ میں
گمرہی نے بچا لیا مجھ کو

ورنہ کر کر کے مکر مَر جاتا
سادگی نے بچا لیا مجھ کو

مُجھے معلوم ہے اک دوسرے کی ضد ہیں یہ
میں نہ ''ہے'' چاہتا ہوں اور نہ ''نہیں'' چاہتا ہوں

مجھ پہ کھلتے ہی نہیں معنیِ اثبات و نفی
میری ہر بات کے آخر میں وہ ''ہُوں'' کہتے ہیں

باغِ ہست و بود میں ایسی چھڑی مَیں مَیں کی جنگ
پتّا پتّا بوٹا بوٹا ڈالی ڈالی ہوگیا

ایک مدّت سے نہ دی اِس نے بھی ٹِک ٹِک کی خبر
دل کا یہ گھڑیال بھی سب بج کے خالی ہوگیا

خواص نے جو دیا ہے بہ نامِ عقل و شعور
وہی مغالطۂ فکر، عام چل رہا ہے

نگاہِ ساقی کی عجلت پڑی ہوئی ہے مجھے
تمہارے پاس تو فرصت ہے جام بھرنے کی

کچھ اِس طرح سے ہیں ہم کارِ دہر میں مصروف
ہمارے پاس تو فرصت نہیں ہے مَرنے کی

تمہاری بات پہ جب خلق دُھن رہی ہے سَر
مجھے بھی کیا ہے ضرورت سوال کرنے کی

ایک نے بھی نہ کیا یعنی مری بات پہ غور
غیب سے آتی ہوئی کوئی صدا مان لیا

خدا پر آپ ہی جا کر کمندیں ڈالیے صاحب
میں ہُوں اک عام سا انساں مری مجھ تک رسائی ہے

لب کو لب گر نہیں لکھوں نہ لکھوں چشم کو چشم
کیا بنے گا جو خد و خال کو یکجا لکھ دوں

کیا کرو گے جو مَیں مسجد کو کروں مَے خانہ
کیا کرو گے جو مَیں بُت خانے کو کعبہ لکھ دوں

کیا کرو گے جو مَیں ہونے کو نہ ہونا کردوں
کیا کرو گے جو نہ ہونے کو مَیں ہونا لکھ دوں

پردہ اٹھنے کی حقیقت نہ سمجھ میں آئی
اور اک راز ملا یعنی مجھے راز کے بعد

اے خدا کھلنے نہ کھلنے کی حقیقت کیا ہے
ایک در بند ہے پھر ایک درِ باز کے بعد

یقیناً خود کو کھودینا قضا ہونا ہے سجدے کا
یقیناً خود کو پالینا ہے سجدے کا ادا ہونا

بیتابیِ نگاہ پہ کیسے کُھلے مگر
جلوے کو ہے جو جلوہ دکھانے کا انتظار

آپ اپنی کہیے گزریں گے کب اپنے آپ سے
دُنیا کو تو کسی کے ہے آنے کا انتظار

میں خود ہی بڑھ کے تجھ سے کروں گا معانقہ
کس کو ہے تیرے ہاتھ بڑھانے کا انتظار

بہ وجہِ قحط ارزانی سمجھ میں آئی ہے مجھ کو
بڑی مُشکل سے آسانی سمجھ میں آئی ہے مجھ کو

بہت گنجان آبادی میں میں نے زندگی کی ہے
کہوں کیا کیسے ویرانی سمجھ میں آئی ہے مجھ کو

میں پتھر کا ہُوا ہوں جب سے اِس آئینہ خانے میں
سمجھ لو تب سے حیرانی سمجھ میں آئی ہے مجھ کو

اگر ہے کچھ تو وہ بھی اہرمن ہی کی بدولت ہے
جو کچھ یزداں کی یزدانی سمجھ میں آئی ہے مجھ کو

سمجھ میں آیا انسانوں میں انساں بن کے بس رہنا
نہ درویشی نہ سلطانی سمجھ میں آئی ہے مجھ کو

کیا کوئی راز ہے کہیں موجود
کیوں مجھے رازداں کی حسرت ہے

کسی صورت ہو یہ جہاں آباد
ایک بے خانماں کی حسرت ہے

اے خدا بھیج کوئی خانہ خراب
بے اماں کو اماں کی حسرت ہے

گزر آیا ہر اک سوال سے میں
اب نہیں کی نہ ہاں کی حسرت ہے

جواب دے کے ہر اک بات کا کہاں چلے تم
ابھی تو تم سے خدا کا سوال رہتا ہے

خلا ہے، میں ہوں، خدا ہے، کہ واہمہ ہے، کوئی
ہے کون مجھ میں جو بن کر مُحال رہتا ہے

یہ اور بات کہ پہچانتا نہیں کوئی
ہمارے بیچ وہ بے خدّ و خال رہتا ہے

کبھی کسی سے کروں گا نہ میں خدا کا سوال
کہیں سے ڈھونڈ کے مجھ کو میرا پتا لادو

کسی بھی طرح مرے دل کو چین تو آئے
خدا نہ لاؤ سرے کا کوئی سرا لادو

خدا سے اچھا تو بُت ہے مری نظر میں نوؔید
کہ ایک ٹوٹے تو تم مجھ کو دوسرا لادو

کردی ہے ختم میں نے ہر اک سے خدا کی بحث
انسان و آدمی کی طرف آرہا ہوں میں

ہر پھر کے جا رہا ہوں اگرچہ میں خود سے دور
ہر پھر کے آپ اپنی طرف آرہا ہوں میں

میری خودی سے یعنی مخاطب ہے اب خدا
تیزی سے خامشی کی طرف آرہا ہوں میں

خاص ہے بات ہماری کہ کوئی عام سی بات
کیسے اندازہ لگائیں تِری ''ہُوں'' سے پہلے

کتنا مشکل کیا تو نے اِسے دے کر معنی
کتنی آسان تھی دنیا تیری ''یُوں'' سے پہلے

مست تھے ایک تگ و تازکی دنیا میں سب
مضطرب کوئی نہ تھا خوابِ سکوں سے پہلے

کب سے سمجھا رہے ہو کوئی سمجھتا ہی نہیں
تم نے اے رشکِ جنوں ایسا بھی سمجھا کیا ہے

بہ ظاہر گو نظر آتا نہیں مصروف میں تم کو
کہ پیدا وہم سے روحِ حقیقت کر رہا ہوں میں

مرحلہ دین کی مشکل کا تھا آسان کیا
کفر ہے جس نے مجھے صاحبِ ایمان کیا

تیری محفل میں جہاں بول رہے تھے سب ہی
ایک خاموش نے مجھ کو بہت حیران کیا

ایک ہیں عقل کے باطن میں سوال اور جواب
اِک یہی بات ہے جس نے مجھے ہلکان کیا

تم اگر مجھ کو قتل بھی کردو
میری حُجت مگر نہ ہوگی تمام

میں ابھی ہُوں یہاں ابھی ہوں وہاں
یعنی میرا سفر ہے میرا قیام

اپنے نصفُ النّہار پر ہوں میں
نہ مِری صبح ہے نہ میری شام

میر صاحب ہی ہو گیا مشہور
''گون'' رکھا تھا میں نے اپنا نام

تھی کس کو یہ خبر کہ پسِ پردہ کون ہے
مجنوں کے عشق نے تجھے لیلیٰ تو کر دیا

خود سے الگ نہ کر سکا شیطان کا وجود
آدم نے تیرے امر کو سجدہ تو کر دیا

اب دیکھئے دکھاتا ہے کیا ہم کو شوقِ دید
اک آنکھ میں ہر آنکھ کو یکجا تو کر دیا

دب کر خیالِ کہنہ تلے مرچکی تھی عقل
دے کر خیالِ نَو اُسے زندہ تو کر دیا

مگر یہ بات کہ وہ راستی کے بس میں نہیں
جو آ گہی کا سِرا گمرہی میں رکھا ہے

اُسے سمجھ نہیں سکتے یہ تیرے سجدہ گزار
جو بندگی کا مزا کافری میں رکھا ہے

مجھے خبر ہے سکونت میں مل نہیں سکتا
وہ اک سکون جو آوارگی میں رکھا ہے

اگرچہ ہے دلِ آوارہ کو طلب گھر کی
مگر وہ گھر کہ جو گھر بے گھری میں رکھا ہے

کسی سوال میں غلطان ایک بھی نہ مِلا
خُدا بہت مِلے انسان ایک بھی نہ مِلا

کسی نے بھی نہ اُٹھایا سوالِ دیدہ ودید
کہ پیشِ آئنہ حیران ایک بھی نہ مِلا

ہمارا وہم حقیقت سے پھوڑ آیا سَر
مُحال کو مگر امکان ایک بھی نہ مِلا

حواس باختہ ہی آئے سب نظر مجھ کو
بجا ہوں جس کے سب اوسان ایک بھی نہ مِلا

ہزار عشق کے مارے ہوئے مِلے مجھ کو
جسے ہو عقل کا ارمان ایک بھی نہ مِلا

سب یہ سمجھے کہ مسیحائی ہم آغوش ہوئی
واقعہ یہ ہے کہ بیمار سے بیمار مِلا

تشنگی روح کی اور جسم کی جب ایک ہو پھر
لب پہ لب رکھ کفِ رخسار سے رخسار مِلا

تھا وہ غافل نظر آیا جو بہ ظاہر ہشیار
اور جو مست ملا مجھ کو وہ ہشیار مِلا

آوارہ و جنوں زدہ و خوار جان کر
مجھ پر ہنسے ہیں سب مجھے بیکار جان کر

تُو کس قدر حسین ہے دنیا کو کیا خبر
تجھ کو گلے لگایا ہے تلوار جان کر

چھوڑ دو اُس پہ ہی کیا اُس کا برہنہ ہونا
کیا کرو پہلے سے گر دید کا ساماں نہ کرو

میں نے افلاک پر نہیں ڈھونڈا
زندگی میں تجھے تلاش کیا

راستی میں نہ جب نظر آیا
گمرہی میں تجھے تلاش کیا

رنگ میں جب نہ تُو نظر آیا
سادگی میں تجھے تلاش کیا

جب خدا میں نہ تُو نظر آیا
آدمی میں تجھے تلاش کیا

غیب میں جب نہ تو نظر آیا
بُت گری میں تجھے تلاش کیا

جب نہ اِس اُس میں تُو نظر آیا
آپ ہی میں تجھے تلاش کیا

جب نہ تُو شور میں سنائی دیا
خامشی میں تجھے تلاش کیا

میں نے بھی ترک کر کے لفّاظی
شاعری میں تجھے تلاش کیا

آپ سمجھے کہ ہے خدا کی بات
آپ کی بات کر رہا تھا میں

مار کر تم نے کر دیا زندہ
جی رہا تھا نہ مر رہا تھا میں

ایک آنچل نے مجھ کو گھیر لیا
جب ہَوا سا گزر رہا تھا میں

سوچتا ہوں کہ اِس خرابے میں
کیا رہا تھا اگر رہا تھا میں

ہر ایک زمانے میں مجھے پائے گا موجود
جو اپنے زمانے میں مجھے یاد کرے گا

جب غور کرے گا یہ جہاں ''کیا'' ہے یہ ''کیوں'' ہے
انسان مِری فکر کو بنیاد کرے گا

جب پیش کروں گا میں دلیل اپنے کہے کی
چُپ ہوگا کوئی اور کوئی صاد کرے گا

اک طفل کے مانند وہ دنیائیں بنا کر
آباد کرے گا کبھی برباد کرے گا

بدن کا کون سا نشّہ تھا جو بدن میں نہ تھا
وہ پیرہن میں تھا اتنا کہ پیرہن میں نہ تھا

سرود و ساقی و جام و شراب و نشّہ و رنگ
وہ کون تھا کہ جو اُس شب اُس انجمن میں نہ تھا

اوّل کوئی سِرا ہے نہ آخر کوئی سِرا
اِس بات کا نہ جاننا غفلت کی بات ہے

مزدوریِ سوال سے فرصت نہیں ہمیں
کیا عشق کیا جنوں یہ فراغت کی بات ہے

اہلِ خبر کے واسطے مکرِلطیف ہے
تم جس کو کہہ رہے ہو عبادت کی بات ہے

یہ شاعری نہیں ہے یہ کچھ اور ہے نوؔید
ہے واہ وا کی بات نہ شہرت کی بات ہے

اور اگر انساں بنوں میں چھوڑ کر سب رنگ و نسل
کہتے ہیں یہ بات لامذہب بناتی ہے مجھے

لے آئے سب اگرچہ خدا کو جواب میں
لیکن مِرے سوال کی حیرت نہ کم ہوئی

دانشوری نے سب کی کیا گرچہ دل نڈھال
انساں کی میرے دل سے محبت نہ کم ہوئی

جان سے ہوں میں اپنی جاسکتا
آپ کا دل نہیں دُکھا سکتا

اے خدا درد کس کو دکھلاؤں
زخم ہوتا تو میں دکھا سکتا

نغمہ و نوحہ بھول جاتے تم
کاش میں خامشی سنا سکتا

خامشی کا جواب خاموشی
تیرا میرا حجاب خاموشی

بس کہ تیرے کلام کے آگے
ہوئی ہے لاجواب خاموشی

اک طرف بے حساب نطق کا شور
اک طرف بے حساب خاموشی

اور نشّہ ہے میرا نشّۂ ''ھُو''
اور میری شراب خاموشی

ہے جہاں خلق کا خدا غائب
بندگی کی پڑی ہوئی ہے مجھے

ہے جہاں سب کا کام پُرکاری
سادگی کی پڑی ہوئی ہے مجھے

ہے جہاں خلق مستِ آبِ بقا
تشنگی کی پڑی ہوئی ہے مجھے

ہے جہاں سب کو راستی درکار
گمرہی کی پڑی ہوئی ہے مجھے

ہے جہاں خلق بے حواس نوؔید
شاعری کی پڑی ہوئی ہے مجھے

ہم نے اِس ڈھونڈ میں اے جستجوئے لا یعنی
کچھ نہ کچھ ڈھونڈتے رہنے کا مزا ڈھونڈ لیا

یہ عجب بھید ہے معلوم و نہ معلوم کا بھید
کھو گیا آپ وہ خود جس نے پتا ڈھونڈ لیا

ایک ہیں ہم نہ ملی ہم کو تو خود اپنی ہی تہہ
آپ ہیں کون خلا جس نے خدا ڈھونڈ لیا

’کیوں‘‘ سے اور ’’کیا‘‘ سے بھلا کس طرح نکلے باہر
عقل اب جائے کہاں ’’ہے‘‘ میں جو تھا ڈھونڈ لیا

مَوت ، تیرے جلوے پر زندگی کا پردہ ہے
سازِ سرمدی تجھ پر خامشی کا پردہ ہے

اِس قدر نہیں آساں کون پہنچے گا مُجھ تک
جب مِری ولایت پر شاعری کا پردہ ہے

خود مُجھے مجھ سے مسلسل کر دیا
آپ نے مجھ کو مکمل کر دیا

پیشِ حُسنِ یار رکھ کر اپنا عشق
بے دلیلی کو مدلّل کر دیا

اُس نے مجھ سے کی پھر اپنے دل کی بات
جب سماعت کو معطّل کر دیا

مسئلے کو دے کے اور اک مسئلہ
مسئلے کا مسئلہ حل کر دیا

شکوے کا وقت ہے نہ شکایت کا وقت ہے
عاجز کے پاس صرف محبت کا وقت ہے

چھیڑا ہے دل نے پھر کسی نازک خیال کو
وقتِ نزولِ شعر ہے، آیت کا وقت ہے

جو بھی ہے اب محمدؐ و عیسیٰؑ کی بات ہے
کعبہ ہی رہ گیا نہ کلیسا ہی رہ گیا

قسمت میں اُس کی کیا کبھی ہونا نہیں گُہر
کیا قطرے کے نصیب میں دریا ہی رہ گیا

خدانہیں ہے کہ ہے سب یہی سُنا رہے ہیں
وہ کون ہے کہ جو انسان کی سُنائے گا

آبِ رواں کی صورت بہنا سیکھ لیا
ہم نے اپنے ساتھ ہی رہنا سیکھ لیا

اپنے خدا ہونے سے گزر کر ہم نے بھی
انسانوں کے بیچ میں رہنا سیکھ لیا

ہم کوئی دانا تو نہیں تھے اے مالک
ہم نے کہاں سے ذلّت سہنا سیکھ لیا

وہ بھی کیا تھے عیش کے دن جب ہُوا غم کرلیا
جب بھی چاہا رولیے جب چاہا ماتم کرلیا

کس میں ہے جرأت کرے جو تیرے منشا پر سوال
غیر کس کو کر دیا اور کس کو محرم کر لیا

سزا کی بات ہو چاہے کہ ہو جزا کی بات
خدا کے نام پہ بدلی گئی خدا کی بات

اُسی حکیم نے یعنی کیا ہے درد ایجاد
وہ جس نے درد سے پہلے ہے کی دوا کی بات

تم مجھے راستی نہ سکھلاؤ
مَیں ہر اک گمرہی سے گزرا ہُوں

عقل کیا ہے مجھے بھی ہے معلوم
مَیں بھی دل کی گلی سے گزرا ہُوں

مجھ کو بہلا سکی نہ سیرابی
جانے کِس تشنگی سے گزرا ہُوں

بشر اجزا در اجزا ہے، عناصر دَر عناصر ہے
کہا کس نے کہ خاک و آتش و آب و ہَوا تک ہے

ہوچکی بے معنویّت ، معنویّت ہوچکی
سوچتا ہوں اور کیا باقی ہے ہونے کے لیے

جانے کس بچے کو بہلانے بنی ہے کائنات
جانے کس بچے نے کی تھی ضد کھلونے کے لیے

فکر کی خاطر کسی کو دی گئی ہے زندگی
اور کسی کو دی گئی ہے صرف ڈھونے کے لیے

ہر صُبح پھر وہی ہے تماشا خدا گواہ
یعنی وہی ہے ہونا نہ ہونا خدا گواہ

سب کچھ تھا اِس جہان میں ''کیا'' اور ''کیوں'' نہ تھے
انسان نے کیا اِنہیں پیدا خدا گواہ

یعنی ہے درمیاں میں خدا بیچ میں ہے مَوت
آساں نہیں ہے خود سے گزرنا خدا گواہ

لالچ ہے تیری وجہِ عبادت خدا قسم
ہے خوف تیرا مُوجدِ سجدہ خدا گواہ

تجھ کو ہے کون روزِ قیامت کا انتظار
ہر روز ایک حشر ہے برپا خدا گواہ

اِس کیفیت کا حال کسی بے بسر سے پُوچھ
دل بیٹھنا ہے شام کا ڈھلنا خدا گواہ

اے بے دلیِ دل مرا کیا کیا چلا گیا
ہنسنا چلا گیا مِرا رونا چلا گیا

سکتے ہی میں پڑا رہا مَیں چشم و دل کے بیچ
اور وقت تیز تیز گزرتا چلا گیا

آیا نہ یہ خیال کہ رویا تھا میں کبھی
دُنیا پہ جب ہنسا تو مَیں ہنستا چلا گیا

قدموں سے گو لپٹتی رہیں منزلیں ہزار
پر مَیں کہیں رُکا نہیں چلتا چلا گیا

آدم کی آنکھ سے یہاں خاتم کی آنکھ تک
وہ ایک ہی تھا اشک جو بہتا چلا گیا

کیونکر کہوں کہ کوئی خُدا چاہیے نیا
جینے سے جینا مَرنے سے مرنا چلا گیا

تھا وہم یا گُمان ، تھا امکان یا خیال
جو میرے دل میں میرے سِوا تھا، چلا گیا

سُلجھانا تھی جو موت کی گتّھی سو اِس لیے
میں منہ میں اپنی مَوت کے زندہ چلا گیا

تم جانو جو لکھا ہے وہ الہام ہے کہ وحی
میں تو بس اک جنون میں لکھتا چلا گیا

دیکھا جو اِس جہاں کے عقب میں جہاں اک اور
میں خیرہ چشم اک نئی حیرت میں آ گیا

حسرت تھی دیکھنے کی کہ دیکھوں خدا کا حسن
تُو ہو کے برہنہ مِری خلوت میں آ گیا

تصویر بن گیا جو بعید از خیال تھا
یعنی سمٹ کے وہم حقیقت میں آ گیا

آزاد رہ کے یوں بھی تھا مَیں بے دلی کا رزق
اچھا ہوا کہ دامِ محبت میں آ گیا

اب سوچتا ہوں کاش میں سن لیتا عقل کی
دل کے کہے میں آ کے مصیبت میں آ گیا

تو جو کرتا ہے خلق کو سیراب
مَیں تِری تشنگی پہ مرتا ہُوں

اے کہ پُرپیچ و پُرخم و پُرکار
میں تِری سادگی پہ مرتا ہُوں

اے حسیں تو جو بولتا ہے بہت
مَیں تِری خامشی پہ مرتا ہُوں

بوالہوس ہُوں کہ ہُوں مَیں حُسن پرست
کون ہوں ہر کسی پہ مرتا ہُوں

کوئی پروانہ تو نہیں ہُوں مَیں؟
کس لیے روشنی پہ مرتا ہُوں

کیا خبر اُس کو کیا چھپانا تھا
الف لیلیٰ جو وہ سنا گیا ہے

یعنی میرا نہیں ہے کوئی سِرا
یعنی میرا سِرا وہ پاگیا ہے

مشاہدہ کِیا کیا اُس نے پھر حقیقت کا
وہ جس کے وہم نے خود کو حباب دیکھا نہیں

وہ کیسے لائے گا اُس کی برہنگی کی تاب
وہ جس کی چشم نے اُس کا حجاب دیکھا نہیں

وہ جس نے خود کو ہی پایا نہیں کتاب کے بیچ
پھر اُس نے متن میں صاحب کتاب دیکھا نہیں

تماشا جب تلک جاری ہے ہونے اور نہ ہونے کا
یہ ہنسنا جا نہیں سکتا یہ رونا جا نہیں سکتا

سلجھتی ہے جو اک گتھی تو اک گتھی الجھتی ہے
الجھنا جا نہیں سکتا سلجھنا جا نہیں سکتا

اپنی خلوت میں دیا اپنا جلاؤ ، جاؤ
آگ ہُوں میں مِرے نزدیک نہ آؤ ، جاؤ

اپنی تکمیل کا سامان مہیّا ہے تمہیں
میری تعظیم میں تم سر نہ جھکاؤ ، جاؤ

سُنو! جو کرتا ہے اِس شور میں سکوت کلام
کہ عرش و فرش کا سارا بدل رہا ہے نظام

ہوئے ہیں درہم و برہم تمام برج و مدار
زمیں پہ گِر رہے ہیں آسماں دھڑام دھڑام

یہ وقت وہ ہے کہ جب دونوں وقت مِل رہے ہیں
ہے جارہی شبِ کوچ آرہی ہے صبحِ قیام

کسی کا وقتِ غروب اور کسی کا وقتِ طلوع
ہے الوداع کسی کو تو ہے کسی کو سلام

نہ جان پائے تغّیر کو جو حقیقتِ دہر
وہ دفن ہونے کو ہیں زیرِ خاکِ خوابِ دوام

کشیدکی گئی ہے جو برائے نشّہء ''ھُو''
پلائے گا نیا ساقی اُسی شراب کے جام

خدا جب دل میں ہے اپنی تمنّا کیوں نہیں کرتے
مجھے سمجھاؤ آخر خود کو سجدہ کیوں نہیں کرتے

نہیں ہے دُوسری صورت کوئی جب خود کو پانے کی
خُدا ہونے کی خاطر خود کو بندہ کیوں نہیں کرتے

آوارگی کو کام میں لانے کا وقت ہے
یعنی یہ وقت آپ میں آنے کا وقت ہے

طاری ہے مجھ پہ بے خبری اے حریمِ ناز
یہ تیرے رُخ سے پردہ اُٹھانے کا وقت ہے

وارفتگی سے کہتی ہے یہ حسرتِ وصال
یہ تیغ کو گلے سے لگانے کا وقت ہے

کہہ دے کوئی نسیم و صبا سے اِدھر نہ آئیں
صحرا میں میرے خاک اُڑانے کا وقت ہے

کہتی ہے دل سے شام کی وحشت کہ اے غریب
اُٹھ خاک سے، چراغ جلانے کا وقت ہے

جنون و وحشت و آوارگی سے گزرے بغیر
یہ عشق دعویٰ ہے بے چارگی سے گزرے بغیر

وہ جس کے پاس نہیں تھا کوئی تصوّرِ موت
سُنا ہے مرگیا وہ زندگی سے گزرے بغیر

تُو کس طرح سے مُکمل کرے گا اپنا وجود
خود اپنے آپ میں اپنی کمی سے گزرے بغیر

کسی طرح سے جو تُو بننا چاہتا ہے خدا
رہے گا خواب ہی یہ بندگی سے گزرے بغیر

مجھے بتا تو سہی کس طرح یہ ممکن ہے
تُو نُطق چاہتا ہے خامشی سے گزرے بغیر

ہے کیا وجود، حقیقت کی روشنی کیا ہے
یہ کیسے جانے گا تُو تیرگی سے گزرے بغیر

عقل اور عشق کو کیوں وہم میں یکجا نہ کرے
کیا کرے کوئی حقیقت کا گر ایسا نہ کرے

اپنی تنگی میں کہاں خود کو چھپائے آخر
کیا کرے حُسن اگر خود کو برہنہ نہ کرے

خود پہ مرنے کے لیے یعنی مَیں خود کافی ہُوں
مُجھ پہ مرنے کی کوئی اور تمنّا نہ کرے

اُس سے کہنا اُسے درپیش ہے تکمیل اگر
قطرے کو کرلے گُہر قطرے کو دریا نہ کرے

یا وہ خود آپ تماشے میں ہو آ کر شامل
خود کو پردے میں ہے رکھنا تو تماشا نہ کرے

جب تک گماں کی شکل بنائے گا کوئی غیب
تب تک تو بُت تراش چُکا ہوگا اک یقیں

ہوئی مُدّت خدا کو دل سے گئے
دل سے لیکن خلا نہیں جاتا

کون تھا وہ جو پھر نہیں آیا
صبر ہوتا تو آ نہیں جاتا

روشنی جاتی ہے جہاں تک جائے
اُس کے پیچھے دیا نہیں جاتا

اگر ہے دل ترے پہلو میں دل سے کام تو لے
کلام کر کہ نہ کر تُو مِرا سلام تو لے

وہ جس نے دشنہ ترے دل میں کردیا پیوست
معاف کر کے ذرا اُس سے انتقام تو لے

یہ میں نے مانا کہ نشّے سے تُو گزر آیا
تکلفاً سہی ساقی سے اُٹھ کے جام تو لے

ملے گا کیا تجھے تسبیحِ اسم و معنی میں
وہ جس کا نام نہیں کوئی اُس کا نام تو لے

کہ خود بخود ترے کاسے میں آ گرے گی صبح
تُو آ کے میرے پیالے سے ایک شام تو لے

بس اک تُم ہی ہو سوئے ہوئے وہ کون ہے جو بیدار نہیں
تُم مجھ سے مکر نہیں کرنا، تم مجھ سے بڑے مکّار نہیں

شاعر تو بڑا مجھے مانتے ہیں ''لیکن'' بھی ساتھ لگاتے ہیں
تُف ہے اُن کے اقرار پہ جب ''لیکن'' سے بڑا انکار نہیں

ہر خبر پر نظر ہے تیری اگر
تجھ کو اپنی خبر ہوئی کہ نہیں

اے ہمہ وقت گوش بَرآواز
خامشی بھی کبھی سُنی کہ نہیں

کون ہے بڑھ کے جو گواہی دے
میں نے حجّت تمام کی کہ نہیں

کیسے کہوں کہ مَوت کا کُھلنا ہے زندگی
جو موت پر پڑا ہے وہ پردہ ہے زندگی

تُو میری مان مَوت کے بارے میں غور کر
یہ راز جاننا ہے اگر کیا ہے زندگی

سمجھو حیات لائی قضا لے گئی انہیں
جن کو نہ سوچنا نہ سمجھنا ہے زندگی

اب دیکھیں کیا دِکھاتا ہے اس کو فنا کا خوف
قطرہ سمجھ رہا ہے کہ دریا ہے زندگی

یزداں و اہرمن سے چُھڑائیں گے کیسے جان
وہ جن کو جینے مَرنے کا جھگڑا ہے زندگی

ظاہر نہ دیکھ لمحے کے باطن پہ غور کر
مانا فقط پلک کا جھپکنا ہے زندگی

اِس زندگی کو دیکھ فقط اپنی آنکھ سے
ورنہ تو چشمِ قیس میں لیلیٰ ہے زندگی

در کار زندگی ہے تو مَرنے سے پہلے مَر
پنہاں جو موت میں ہے وہ پیدا ہے زندگی

دھیان سے کر دیا مجھے بے دھیان
تُم نے کیسا سوال کر لیا ہے

ہر اک امکان مسترد کرکے
خود ہی ممکن مُحال کر لیا ہے

منہ سے تو کچھ نہیں وہ بولتا ہے
آنکھوں آنکھوں میں مجھ کو تولتا ہے

کھولنے والا غیب کے اَسرار
بند، بندِ قبا کے کھولتا ہے

جستجو ہو جسے حقیقت کی
بس وہی عقل و دل ٹٹولتا ہے

بس اُسے حق ہے بولنے کا نوؔید
جو خدا کی زبان بولتا ہے

مَیں کون ہُوں جب اُس کی سمجھ میں نہیں آیا
ٹھوکر کبھی ماری کبھی سینے سے لگایا

تھاما جو کبھی دامنِ یزداں پسِ وحشت
بس چاک مجھے اپنا گریباں نظر آیا

کیسا ہے ترے مقنع و چادر کا کرشمہ
یہ جسم دکھایا ہے کہ یہ جسم چھپایا

کیا سمجھیں گے چمٹے ہوئے بیٹھے ہیں جو خود سے
کھونے جو گیا خود کو، وہ کیا ڈھونڈ کے لایا

میرے ہونے کو مگر جنس میں مت کرنا تلاش
یعنی یوسفؑ سا بھی ہُوں یعنی زلیخا سا بھی ہُوں

میں نہ ظاہر ہُوں نہ پوشیدہ ہُوں اے دیدہ ورو
یعنی جلوہ سا بھی ہُوں یعنی مَیں پردہ سا بھی ہُوں

سب کے ہاتھ آئے ہیں اگر پتھر
میں بھی خوش ہُوں کے سر ملا ہے مجھے

میں تو سمجھا ہوں زندگی کا اذن
موت کی شرط پر ملا ہے مجھے

تم نہ سمجھو گے آگہی کیا ہے
با خبر بے خبر ملا ہے مجھے

زندگی تیرے کھیل کا مفہوم
جان پر کھیل کر ملا ہے مجھے

درویشی و سلطانی نہ آئے گی کسی کام
دنیا کے تماشے سے گزرنا تو پڑے گا

دنیا سے یہ دل چاہے اٹھاؤ کہ لگاؤ
رونا تو پڑے گا تمھیں ہنسنا تو پڑے گا

وہ دشت ہو وہ در ہو وہ صحرا ہو جبل ہو
یا راہ میں یا آپ میں رہنا تو پڑے گا

دل پر ہو کہ جاں پر ہو خدا پر ہو کہ تم پر
کوئی نہ کوئی پردہ اٹھانا تو پڑے گا

اب چاہے جیو بن جیے چاہے مرو بے موت
جینا تو پڑے گا تمھیں مرنا تو پڑے گا

پردے کو جس نے جلوہ بنایا وہ کون ہے
خود سے بھی جس نے خود کو چھپایا وہ کون ہے

مانع ہے یہ حجاب کہ مانع ہے یہ غیاب
جو اپنے سامنے بھی نہ آیا وہ کون ہے

خود کو بھی جس نے خود کا نہ ہونے دیا شریک
وہ جو ''نہیں'' نہ ''ہے'' میں سمایا وہ کون ہے

امکان بن کے جس نے دکھائی بس اک جھلک
وہ جو خیال میں بھی نہ آیا وہ کون ہے

انساں کے دل کو جس نے بنایا خود اپنا عرش
پھر دل میں خود ہی آن سمایا وہ کون ہے

اِس جاننے کو کیوں نہ کہوں اپنا جاننا
جانا یہ میں کہ جان نہ پایا وہ کون ہے

یہ جبرِ حُسن ہے یا اختیارِ عشق ہے یہ
نہیں ہے چارہ کوئی تجھ کو ماننے کے سوا

نہ کوئی کھیس نہ چادر نہ کوئی عرش نہ چھت
کہ سَر پہ کچھ بھی نہیں خود کو تاننے کے سوا

ہمارے اگلے ارادے کی پوچھتے کیا ہو
کہ ٹھاننے کو نہیں کچھ نہ ٹھاننے کے سوا

کفن سے جان چھڑانے کا راستا ہی نہیں
بدن کو جاک میں اور خوں میں سانے کے سوا

خدایا رہ گئی عزت کہ تیری دنیا نے
نہ جانا کچھ مجھے آوارہ جاننے کے سوا

نہیں ہے مجھ کو سماعت کا امتحاں منظور
کہ خامشی کی زباں سے کلام کرنا ہے

یہی ہے فکر کے مٹ جائے فرقِ عام و خاص
کب اس سُخن کے عوض مجھ کو نام کرنا ہے

سمیٹنا ہے مجھے کائنات نقطے میں
کہ میکدے کو فقط ایک جام کرنا ہے

یہ کوئی یعنی و لا یعنی فلسفہ نہیں ہے
یہ ایک بات ہے بس جس کو عام کرنا ہے

یعنی یہ بات ہے یکسوئی کی
بات جَلوت کی نہ خَلوت کی ہے

پوچھ مکّہ و مدینہ ہم سے
دل سے دل تک جو یہ ہجرت کی ہے

سَر جُھکایا تو سَر اُٹھایا نہیں
کام سے جی کبھی چُرایا نہیں

کیسے اُٹھے گا غیب کا پردہ
خود سے پردہ اگر اُٹھایا نہیں

کیسے پُر ہوگا پھر خلا تیرا
خود میں ہی تو اگر سمایا نہیں

سب خُدا ڈھونڈنے میں صرف ہوئے
ڈھونڈ کر کوئی خود کو لایا نہیں

کیسے میری سمجھ میں آئے خدا
میں نے جب بت کوئی بنایا نہیں

وہ خدا کہہ کے ہو گیا خاموش
میں نے بھی بات کو بڑھایا نہیں

ہو کے چُپ خامشی پہ غور کرو
پھر نہ کہنا کہ کچھ سنایا نہیں

مجھ پہ کھولا ہے بے دری کا در
غیب نے در بہ در پھرایا نہیں

کہہ رہا ہے بہت اندھیرا ہے
جس نے اپنا دِیا جلایا نہیں

گر سمجھ میں مری آجاتا یہ جینا مرنا
اے خدا زندگی و موت سے گھبراتا کیا

نفس پڑھنے کی اگر میں نہ ریاضت کرتا
مجھ سے کہتا جو تو اقراء تو میں دہراتا کیا

''کیا'' سے اور ''کیوں'' سے یہ دنیا ہی پلٹ دی اِس نے
خود کو دنیا کے کھلونے سے میں بہلاتا کیا

اے خدا تو نے کیے ہیں کس لیے اتنے جتن
خود کو ظاہر کرنے یا خود کو چھپانے کے لیے

ماننے کی بات ہے یہ اور نہ منوانے کی بات
بات ہے یہ بات کو آگے بڑھانے کے لیے

کیا خبر قصداً ہوا یا ہوگیا
اب کروں کیا اب تو پیدا ہوگیا

اک حقیقت کے جو دو ٹکڑے ہوئے
اک خدا اور ایک بندہ ہوگیا

ختم ہوتی ہی نہیں تیری تلاش
دیکھ اب قطرہ بھی دریا ہوگیا

کیاجیوں اور کیا مروں میں اے خدا
جینا مرنا جب تماشا ہوگیا

''ہے'' بھی نہیں وہ یعنی کہ ''تھا'' بھی نہیں ہے وہ
انسان جب سے بدلا خدا بھی نہیں ہے وہ

جب ''مَیں'' سے اور ''تو'' سے مَیں گزرا تو یہ کُھلا
وہ صفر بھی نہیں ہے کہ لا بھی نہیں ہے وہ

وہ ہے الف سے پہلے وہ ہے بعد میں یے کے
خاموشی بھی نہیں وہ صدا بھی نہیں ہے وہ

جب میرا کوئی ''کوئی نہیں'' سے بدل گیا
تب مجھ پہ یہ کھلا کہ پتا بھی نہیں ہے وہ

''وہ'' کس کو کہہ رہے ہو کسے کہہ رہے ہو ''یہ''
اِس اُس میں کیا سمائے کہ ''مَا'' بھی نہیں ہے وہ

یہ عقل کا ہے کھیل تماشا ہے چشم کا
ظاہر بھی وہ نہیں ہے چُھپا بھی نہیں ہے وہ

یہ وہم ہے یا میرا ہی ہونا ہے مِرے گِرد
کھلتا ہی نہیں کیسا تماشا ہے مِرے گِرد

یہ نیم نگاہی ہے مِری یا ہے یہ ابہام
اٹھتا ہے نہ گرتا ہے جو پردہ ہے مِرے گِرد

ہے کون بیک وقت جو حاضر ہے نہ غائب
پنہاں ہے کوئی یا کوئی پیدا ہے مِرے گِرد

یہ راز مرے غیر پہ ہر گز نہ کھلے گا
میں گِرد ہوں لیلٰی کے، کہ لیلٰی ہے مِرے گِرد

کوئی مجھے سمجھاؤ کہ معنی اسے کیوں دوں
کیا میری بنائی ہوئی دنیا ہے مِرے گِرد

جھگڑا یہ نمٹ جائے تو آغاز کروں بات
جو زندگی و موت کا جھگڑا ہے مِرے گِرد

عقل بیداریِ جاں ہے جبکہ یہ دل نیند ہے
نیند ناقص مَوت ہے اور موت کامل نیند ہے

تو سوالِ ماء و تو میں مبتلا ہوکر تو دیکھ
کتنا آساں جاگنا ہے کتنی مشکل نیند ہے

دل میں اُس کے تھی یہی حسرت جو مجنوں مَر گیا
جاگتی ہے جس میں لیلیٰ بس وہ محمل نیند ہے

خواب ہی کو بس حقیقت جاننے لگتا ہے تو
جو حقیقت سے تجھے رکھتی ہے غافل نیند ہے

جاگنے سونے کے بیچوں بیچ ہی رہتا ہے وہم
جو نہ کامل جاگنا ہے جو نہ کامل نیند ہے

یعنی جس میں بن بلائے کوئی آسکتا نہیں
اپنی مرضی کی لگاتی ہے جو محفل نیند ہے

زہر کھا، چاہے سر کٹا حمزہ
بات بگڑی ہوئی بنا حمزہ

اتنا خود کو خدا نہ ظاہر کر
خود کو اتنا نہ تو چھپا حمزہ

ایک دُنیا ہے منتظر تیری
اپنے زانو سے سر اٹھا حمزہ

ابھی باقی ہے قصّۂ درویش
اُٹھ کے یہ تُو کدھر چلا حمزہ

خامشی تک جو آ گئی چل کر
بات کیا ہے مجھے بتا حمزہ

کھُلے رہ جائیں منہ جوابوں کے
اک سوال ایسا چھوڑ جا حمزہ

یہ نہیں تُم نے خود کو مانا نہیں
در حقیقت خدا کو جانا نہیں

وہم کو وہم ہی تلک رکھنا
اِس حقیقت کو بت بنانا نہیں

منزلِ گم کی ہے اگر حسرت
کہیں بھی قصد کرکے جانا نہیں

کہہ رہی ہے یہ ہر نئی دریافت
کیا نیا ہے کہ جو پُرانا نہیں

مجھ کو تو ایک خامشی کے سوا
کچھ بھی سنّنا نہیں سُنانا نہیں

تم سے کرنا ہے ایک راز کی بات
کسی کو ساتھ لے کے آنا نہیں

سوچی، سمجھی، رَچی، بسی، گُزری
اپنی تو مَست زندگی گُزری

جیسے چاہا رہے، جو چاہا کیا
کب ہماری لگی بندھی گزری

کرگئی روح تک مجھے سیراب
مجھ پہ ایک ایسی تشنگی گزری

سب ہی جیتے ہیں سب ہی مرتے ہیں
آپ پر کون سی نئی گزری

نہ ہُوا چپ کوئی برائے خدا
خامشی چیختی رہی، خاموش

خامشی کی زباں سے قصّۂ دہر
سُنا جس نے ہُوا وہی خاموش

چُپ رہو مَت کرو سوالِ عقل
دِل ہُوا ہے ابھی ابھی خاموش

اپنے لیئے مَیں خود کو کھلونا بنا تو لوں
خود سے بہل کے خود کو مَیں بہلا کے کیا کروں

کرنا ہے زندگی تو بہرحال اے خدا
گھبراؤں زندگی سے تو گھبرا کے کیا کروں

جاننا جو محال جانتا ہے
بس وہی میرا حال جانتا ہے

جانتا ہے وہ بندگی کو جواب
جو خدا کو سوال جانتا ہے

جس پہ کھلتا نہیں ہے موت کا راز
زندگی کو وبال جانتا ہے

سب ہی چلتے ہیں اپنی اپنی چال
وقت کی کون چال جانتا ہے

اُس کو سب کچھ خیال لگتا ہے
خود کو جو بے خیال جانتا ہے

کب کسے سخت سُست کہتا ہوں
اپنی مستی میں مَست رہتا ہوں

کوئی جھگڑا کسی سے اور نہ فساد
میں تو پانی کی طرح بہتا ہوں

ہے مرے گِرد ایک خاموشی
جس سے محوِ کلام رہتا ہو

بن کے ''کوئی نہیں'' خدا کی قسم
خلق کے درمیان رہتا ہوں

نغمہ گر، نوحہ گر، نہ سمجھیں گے
آہ اور واہ جو میں سہتا ہوں

صرف یکسوئی تھی ہمیں درکار
کب ہمیں بُت کوئی بنانا تھا

اے خدا کیا تھا مکرِ جلوۂ یار
یہ چھپانا تھا یا دکھانا تھا

میں نے دیکھا ہے یعنی جلوۂ یار
نظر آنا نظر نہ آنا تھا

وہی بندہ وہی خدا یہ بتا
عقل کی حد کو کیا جتانا تھا

دیکھتے تو نظر اٹھا کر آپ
ہر ٹھکانا مِرا ٹھکانا تھا

صبر سے شکر سے اور حکمت سے
وہی کاٹا جو تھا بویا میں نے

کرلیا خود کو اگرچہ بے نام
نام اپنا نہ ڈبویا میں نے

تِرا تصوّرِ کرب و بلا درست نہیں
کہ تیری فکرِ خودی و خدا درست نہیں

اگر ہے کچھ بہ خدا صرف خود نمائی ہے
صدا کے نام پہ کوئی صدا درست نہیں

وہ شور ہے کہ کسی پر بھی کچھ نہیں کُھلتا
یہاں درست ہے کیا اور کیا درست نہیں

خود اپنا ڈھونڈا ہوا راستا ہی منزل ہے
پتا کسی کا بتایا ہوا درست نہیں

وہی درست ہے جو خود کا سوچا سمجھا ہے
سُنا سنایا ہُوا باخدا درست نہیں

ہزار زاویوں سے گھوم گھوم کر دیکھو
کہ اک طرف سے فقط دیکھنا درست نہیں

خودی کے رنگ میں رنگِ دگر بنا نہ گیا
خدا تو بن گئے انساں مگر بنا نہ گیا

اُنھوں نے ڈھونڈ لی دیر و حرم میں جائے پناہ
وہ جن سے شمعِ سرِ رہگزر بنا نہ گیا

نہ ہوگا منزلِ اعراف سے گزر اُن کا
وہ جن سے اپنے لیے خود ہی پر بنا نہ گیا

کہہ دے کوئی کسی سے جو نخوت سے بات کی
ہم ہی ہیں جس نے سب سے محبت سے بات کی

گستاخی کی جناب نہ مِنّت سے بات کی
جس سے بھی ہم نے بات کی حکمت سے بات کی

پوچھا ازل ابد کے تسلسل میں، مَیں ہُوں کون
تھا کام کا سوال سو فرصت سے بات کی

تب جا کے اس نے وا کیے مجھ پر قبا کے بند
لہجے میں وہم کے جو حقیقت سے بات کی

اب مجھ کو دو جواب کہ تم بھی کسی کے ہو
مَیں مان لیتا ہُوں کہ تمہارا کوئی نہیں

تم میں سے ہُوں مَیں اور تمہارے ہی بیچ ہُوں
سمجھو مجھے مَیں اُترا اُتارا کوئی نہیں

کُفر تھا جو سنا سنایا گیا
جہل تھا جو پڑھا پڑھایا گیا

دی گئی بَدعا اندھیرے کو
کب دُعا کا دیا جلایا گیا

آپ کی بات کون سمجھے گا
یہی کہہ کر مذاق اڑایا گیا

کیسے جانیں یہ سخت دل کہ مجھے
نرم دل جان کر دُکھایا گیا

کیا خبر زہر دینے والے کو
کِس ارادے سے زہر کھایا گیا

جوکلیجا نہ کھا سکے اپنا
کسی بُھوکے کو کیا کھلائے گا

جس سے اٹھتا نہیں خود اپنا وزن
بارِ افلاک کیا اٹھائے گا

کرنے کی جس کے پاس بات نہ ہو
نغمہ و نوحہ ہی سنائے گا

یعنی جو رند ہو نہ ساقی ہو
کیا پیے گا وہ کیا پلائے گا

جتنے پردے بھی تھے حقیقت پر
ایک اک پردہ ہم اٹھا کے چلے

وہی ہے جو ورائے حرف و عدد
وہ سبق سب کو ہم سنا کے چلے

نہ ''مَیں'' ہے نہ ''تُو'' ہے
فقط ایک ''ھُو'' ہے

عشق کہتے ہیں کسے صرف سُنا ہے تم نے
ہم نے جھیلا ہے اِس آزار کو ہم جانتے ہیں

اک خبر بن کے گونجتی ہے چُپ
میر صاحب کو لگ گئی ہے چُپ

کام لیتا ہوں صرف ہوں ہاں سے
ایسی سَر پر مِرے پڑی ہے چُپ

جب سے مجھ پر کُھلا ہے رازِ ھُو
تب سے مجھ کو لگی ہوئی ہے چُپ

اور بھی بڑھ گیا ہے اِستغراق
اور بھی گہری ہو گئی ہے چُپ

عرش سے فرش تک ہے سنّاٹا
مَوت سے پہلے مرگئی ہے چُپ

چیخ کا دم بھی جس سے گُھٹ جائے
مَیں نے ایسی بھی اک سُنی ہے چُپ

ہر دو طرح تم میری صدا قتل کرو گے
یا سجدہ کرو گے مجھے یا قتل کرو گے

میں ہاتھ نہ آؤں گا کسی طَور تمہارے
کیا ''صفر'' کا دم گھوٹو گے ''لا'' قتل کرو گے

میں زندگی و موت کے بس میں ہی نہیں ہُوں
کس طرح سے ''کیوں'' مارو گے ''کیا'' قتل کرو گے

مَیں نورِ لطیف اور سُبک نرم ہَوا مَیں
کس طرح سے تم نور و ہَوا قتل کرو گے

ہابیلؑ کا برّح کا لہو تم نے بہایا
اب اپنے سوا کون نیا قتل کرو گے

اے قاتلو بولو تمہیں مہلت کی قسم ہے
کیا نفسِ ذکیّہ سے سِوا قتل کرو گے

شکّ و یقین و وہم و گماں سب بدل گیا
تو کِس جہان میں ہے جہاں سب بدل گیا

تعبیرِ ہست و نیست نئے سلسلے سے دیکھ
امکان، لَو، چراغ، دُھواں، سب بدل گیا

انساں نے جاں چھڑالی سپید و سیاہ سے
رایت، عَلَم، پھریرا، نشاں، سب بدل گیا

انساں پہ یعنی کھول دیے خامشی نے راز
معنی و حرف و لفظ و بیاں سب بدل گیا

انساں میں یعنی حاضر و غیب ایک ہوگئے
رازِ نہاں، طلسمِ عیاں، سب بدل گیا

انسان آ گیا ہے خود اپنی پناہ میں
اب کون امن، کون اماں، سب بدل گیا

انساں نے اپنے بے کراں ہونے کو پالیا
کیسا قیام، کیسی اذاں، سب بدل گیا

درگاہ و مندر و حرم و دیر و خانقاہ
کیا سب ہی کچھ بدل گیا، ہاں سب بدل گیا

معنی بدل گئے سبھی نقصان و نفع کے
یعنی حسابِ سود و زیاں سب بدل گیا

یعنی قرار و گردشِ سیّارگاں کو دیکھ
شرحِ زمین و شرحِ زماں سب بدل گیا

نکلی ہے ''مَیں'' کچھ اس طرح ''تُو'' کے حصار سے
وہمِ مکین و خوابِ مکاں سب بدل گیا

تُو جنبشِ ستارہ میں کب تک رہے گا محو
آ اپنے آپ میں کہ یہاں سب بدل گیا

دَورۂ صبح و شام ختم ہُوا
اے خُدا میرا کام ختم ہُوا

گُزر آیا مَیں اسم و معنی سے
شعبدہ ہائے نام ختم ہُوا

یعنی ساقی و رند ایک ہوئے
فرقِ مینا و جام ختم ہُوا

ہوگئی ایک بات سب کے لیے
فرقِ ہر خاص و عام ختم ہُوا

یعنی انساں نے پالیا خود کو
یعنی کُہنہ نظام ختم ہُوا

یاد آئے گی جب تُم کو وفا میں نہیں ہُوں گا
ڈھونڈو گے تُم اے اہلِ جفا میں نہیں ہُوں گا

ہُوں برگِ گُلِ دہر پہ میں قطرۂ شبنم
لمحہ کوئی آکر جو گیا میں نہیں ہُوں گا

اُس باغ میں ہر صُبح کے مانند نہ پا کر
لینے مجھے آئے گی صبا میں نہیں ہُوں گا

بھولے رہو تم اور ابھی میری ریاضت
یاد آئے گا جب تم کو صلہ میں نہیں ہُوں گا

اّچھا ابھی سُن کر نہ سنو تُم مری آواز
پھر جب مجھے تُم دو گے صدا میں نہیں ہُوں گا

از بس کہ تصوّر میں بدل جائے گی تصویر
رہ جائے گی بس میری صدا میں نہیں ہُوں گا